ہے دنیا میں طوفان بپا طیاروں کی مٹھ بھیڑوں سے
بمباری گولہ باری سے اور ہٹلر کی تقریروں سے
سن نعرہ بابے گاندھی کا ستیہ اور اہنسا من میں رکھ
نربھئے پد تو پا جائیگا ان شانت مئی تحریروں سے

گاندھی ازم

مصنف

باوا گورداس سنگھ جی وید ٹی سی ای (لندن) المعروف "بابا نربھے آچاریہ"
جرنلسٹ و ادیب سابق ایڈیٹر ہندوستان و بلیٹن روزانہ لاہور۔ روزنامہ "اگنی" امرتسر
و مصنف ہندو سنگھٹن کی عملی سکیم، گورکھشا کی عملی سکیم۔ وغیرہ وغیرہ

پبلشرز

امپیریل بک سٹال گھنٹہ گھر امرتسر

قیمت (۱ؔ

بار اول

پبلشرز

بھائی کرپال سنگھ بلبیر سنگھ تاجران کتب

بازار گھنٹہ گھر امرتسر

پرنٹرز

راما آرٹ پریس باہتمام رام ناتھ چھپی

سنتوکھسر امرتسر

فہرست

مصنف کی گذارش

گذشتہ بیس برس سے مہاتما گاندھی جی کی رہنمائی میں آل انڈیا نیشنل کانگرس اہنسا (عدم تشدد) و ستیہ (راستی) کے اصولوں کی آزمائش ہندوستانی سیاسیات کے میدان میں کر رہی ہے۔ ان اصولوں پر گامزن ہو کر کانگرس نے ہندوستانی آزادی کے کئی ایک مدارج طے کر لئے ہیں ان اصولوں کی پیروی نے ملک کو آزادی کے مندر کے نزدیک لا کھڑا کیا ہے۔ اس جدوجہد میں دنیا کے سامنے ایک ایسا نظارہ پیش کیا گیا ہے۔ جو تاریخ عالم میں اپنی مثال نہیں رکھتا۔ ستیاگرہ کی جنگ کا سب سے روشن پہلو یہ ہے۔ کہ اس میں ستیاگرہی اور مخالف کے درمیان تعلقات کشیدہ نہیں ہوتے۔ بلکہ پیشتر سے زیادہ محبت آمیز ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں کے اس تحریک کے سامنے جھکنے سے آج ہندوستانیوں کے ساتھ ان کے تعلقات آغاز تحریک کی نسبت کہیں زیادہ گہری اور مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک اس جدوجہد سے ہندوستان میں مکمل آزادی حاصل نہیں ہو سکی۔ تاہم گذشتہ تجربہ کی بنا پر اس کے ذریعہ حصول آزادی کا یقین پختہ طور پر بندھ چکا ہے۔ ہندوستان کے قومی رہنما اپنی جدوجہد کو انہی اصولوں

پر چلانے کا تہیہ کر چکے ہیں۔ آج تک سیاسی جدوجہد ہمیشہ ہتھیار بند طریقوں پر ہی عمل میں لائی جاتی رہی ہے۔ دنیا عدم تشدد و سچائی پر مبنی جدوجہد کی کامیابی کو دیکھ کر چکا چوندھ ہو رہی ہے۔ اب تو کافی تعداد میں لوگ یورپ و امریکہ میں ان اصولوں کے حامی بن گئے ہیں۔ اسی تحریک کی بدولت آج ہندوستان دنیا میں اپنا سر فخریہ بلند کر سکتا ہے۔ ان اصولوں کے پرچار کا سہرا مہاتما گاندھی جی جیسی مقناطیسی شخصیت کے سر ہے۔ مہاتما جی پہلے اپنے اخبار ینگ انڈیا اور اب ہری جن کے ذریعہ ان کا پرچار دنیا بھر میں کرتے رہے ہیں۔ ہری جن انگریزی اور ہندی میں تو پونا سے شائع ہوتا ہے۔ مگر اردو داں پبلک ابھی تک ان عظیم الشان اصولوں کی حقیقت کو کما حقہ طور پر سمجھنے سے قاصر رہی ہے۔ ہم نے ان کی وضاحت کے لئے اردو داں پبلک کی اس تکلیف کو دور کرنے کے لئے ہی قلم اٹھائی ہے۔

علاوہ ازیں مذہبی توہمات و جنگ کے متعلق رسمی خیالات جو مصنف کی رائے میں حصول آزادی کے راستہ میں سب سے زیادہ حائل ہیں۔ اُن کے متعلق صحیح نظریہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور ہمیشہ کے لئے جنگ وجدال و اقتصادی لوٹ گھسوٹ سے بچنے اور بیکاری، بیماری و غلامی کو کوسوں دور بھگانے کے متعلق چند ذہنی اور عملی تجاویز پیش کی ہیں۔ جو مصنف کے عقل نارسا میں

بلالحاظ مذہب وملت و عمر و جنس یکساں طور پر ہندوستانیوں کے لئے قابل عمل ہیں۔ اردو میں ان خیالات کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے سب سے اول اسی زبان میں اسے شائع کیا گیا ہے۔ اگر اسے پسند کیا گیا۔ تو اسے دیگر زبانوں میں بھی شائع کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں مزید اقدام بھی کیا جا سکتا ہے۔

یہ سلسلہ تحریر کسی سیاسی تبلیغ کے نقطہ خیال سے نہیں بلکہ انسانی بہبودی کے نقطہ خیال سے اور انسانی خدمت کے جذبہ کے زیر اثر شروع کیا گیا ہے۔ اور اپنی کمزور بساعت کے مطابق خدمت کے اس میدان کو وسیع کرنے کی پوری کوشش کی جائے گی۔ اس میں کسی قسم کی غلطی کو درست کرنے یا کسی قسم کی ایزادی کے متعلق ناظرین ہمیں جو مشورہ دیں گے۔ اُسے نہایت شکریہ کے ساتھ قبول کیا جائے گا۔ اور اس پر غور کرنے کے بعد مناسب عمل بھی کیا جائیگا۔

خادم

"نر بھے اچاریہ"

گاندھی ازم کے پرچار کی ضرورت کیا ہے؟

ہٹلر اور گاندھی کی جنگ

جب ہم ہٹلر اور گاندھی کی جنگ کا ذکر کرتے ہیں۔ تو ہمارا مطلب ہرگز یہ نہیں ہوتا۔ کہ یہ ہر دو شخصیتیں روبرو میدان کارزار میں ایک دوسرے سے زور آزمائی کریں گی۔ یوں تو آج کل کی دنیاوی سیاسیات کے رخ کو دیکھ کر ایسا ہونا بھی ناممکنات چھوڑ غیر اغلب بھی نہیں۔ بلکہ عین ممکن ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہٹلر نے انگلستان پر حملہ کر کے سرتوڑ کوشش کر کے دیکھ لیا ہے۔ ابھی اس کے انگلینڈ کو فتح کرنے کے خواب پورے ہوتے نظر نہیں آتے۔ اور کچھ دنوں میں وہاں کا موسم شاید آہنی ریشہ دوانیوں کے لئے بھی سازگار نہ رہے۔ اس نے ابھی سے اپنے مددگار مسولینی سے مشرق وسطی کے متعلق اشتراک عمل کے منصوبے شروع کر رکھے ہیں۔ ایسے حالات میں جلد ہی ہندوستان کے مغربی اور شمال مغربی ساحل پر جنگ کے بادلوں کا نمودار ہونا عین قرین قیاس ہے۔ اگر جنگ ہندوستان میں آئے تو گاندھی جی بھی اس کے خلاف اپنے طریقہ پر صف آرا ہونا امر لازمی ہے۔ لیکن ہمارا اس وقت اشارہ اس مشکوک واقعہ کی طرف نہیں بلکہ اس یقینی تصادم کی طرف ہے۔ جو ہٹلر ازم اور گاندھی ازم کے درمیان ایک نہ ایک دن ہونا اٹل ہے۔ اور جس کی اہمیت کو قبل از وقت سمجھ لینا

ہندوستانیوں کے لئے لازمی ہے۔ بشرطیکہ وہ اس جنگ سے فتحیاب اور سرخرو ہو کر نکلنا چاہتے ہوں۔

موجودہ جنگ میں انگریزوں کی سب سے بڑی مشکل قبل از وقت اس جنگ کی اہمیت کو نہ سمجھنا اور اس کے لئے مناسب تیاری سے پچھڑ جانا ہی ہے۔ اگر اہل انگلستان نے وقت پر جرمنی کی تیاریوں کا پورا پورا جائزہ لے سکتے اور اپنے اندر اس سے زیادہ طاقت پیدا کر سکتے تو آج لڑائی کا رخ کچھ اور ہی ہوتا۔ گذشتہ جنگ یورپ میں جس جرمنی کو شکست دینے میں انگریزوں کو چار سال لگے تھے۔ اب کے پہلے سال میں ہی بول بالا ہو جاتا۔ اور انگریزوں کے دوستوں خصوصاً فرانس کو یہ برا دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر

"اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت"

ہندوستان کی حفاظت کا بوجھ بھی انگریزوں کے کندھوں پر ہے مگر جہاں وہ اپنے ملک کے متعلق مناسب وقت پر کاروائی کرنے سے پچھڑ گئے ہیں۔ وہاں ہندوستان کے متعلق تو وہ اس قدر پس ماندہ حالت میں ہیں۔ کہ بیرونی حملہ کی صورت میں ہندوستان کا خدا ہی حافظ ہے ایسے حالات میں ہر آزادی پسند ہندوستانی کا یہ فرض منصبی ہو جاتا ہے۔ کہ وہ ان حالات کا بغور مطالعہ کرے۔ اور وقت پر مناسب اقدام کے لئے تیار ہو جائے۔

اس سے پیشتر کہ ہم یہ جان سکیں۔ کہ ہمارا فرض منصبی اس وقت

کیا ہے۔ یہ جاننا نہایت ضروری ہے۔ کہ "ہٹلر ازم" اور "گاندھی ازم تحریکوں میں تصادم کی اہمیت کیا ہے۔ اس کے لئے ہمیں پہلے ان ہر دو تحریکوں کی مختصر زندگی پر نظر دوڑانی ہوگی۔

ہٹلر ازم

"ہٹلر ازم" اس راج نیتی کا نام ہے۔ جسے ہٹلر نے ملک جرمنی میں مروّج کیا۔ وہ خود اسے National Socialism (قومی مساوات) کا نام دیتا ہے۔ یوں تو سوشلزم دنیا کے بہت سے ممالک میں موجود ہے۔ اور روس کی کمیونزم دنیا بھر میں سوشلزم کی ترقی یافتہ شکل خیال کی جاتی ہے۔ لیکن ہٹلر کا سوشلزم نیشنل یعنی قومی ہے۔ ہٹلر کہتا ہے کہ جرمن قوم قدرتاً ایسی خصوصیات کی مالک ہے۔ کہ وہ دنیا بھر میں فوجی کام کے لئے موزوں ترین ہے۔ لہذا اس کی سوشلزم پر چلنے کے لئے جرمنی ہی موزوں ترین ملک ہے۔ اس لئے وہ اس کا پرچار اپنی ملکی حدود سے باہر سوائے جرمنوں کے اور کسی میں کرنے کا حامی نہیں۔ اپنے ملک میں بھی اس نے اس سوشلزم کو بنوک شمشیر قائم کیا ہے۔ اپنے سیاسی مخالفوں کو، سرمایہ داروں کو۔ اور غیر نسلی باشندوں کو جس بے باکی اور سفاکی سے اس نے تلوار کے گھاٹ اتارا ہے۔ وہ بھی اس کی عملی سوشلزم کے تاریک ترین پہلو کی روشن تعبیر ہے۔ اپنی قومی بہتری کے نشہ میں اپنی قوم کے معصوم بیگناہوں کے ساتھ جو خون کی ہولی اس نیشنل سوشلزم کے علمبردار نے کھیلی ہے۔ دنیا کی تاریک ترین تاریخ کے اوراق میں بھی اس کی مثال

چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے گی۔ نرمی اور اخلاق اس کی ڈکشنری میں بزدلی اور کمزوری کا نام ہے۔ ذاتی طور پر اس میں کئی ایک خوبیاں بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ شراب نہیں پیتا۔ سگرٹ نہیں پیتا۔ چائے نہیں پیتا۔ گوشت تک نہیں کھاتا۔ ابھی تک کنوارہ بھی ہے۔ یہ سب باتیں اس کے حق میں کہی جاسکتی ہیں۔ لیکن کمزوروں کو کچل دینا۔ غیروں کے حقوق پامال کر دینا۔ زبردستی اپنا کہنا منوانا۔ یہ اس کی سوشلزم میں اور مذہب میں عین ثواب ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی ہندو آرٹسٹ ہٹلر کا ایک موزوں ترین بت بنادے۔ تو اس کے چار سر بنا کر اس کے اوپر ایک گدھے کا سر لگا دے۔ ہندو راون کو جو ہزاروں برس گذرے لنکا کا راجہ تھا۔ ایک وِدوان برہمن تسلیم کرتے ہیں۔ ویدوں کا ترجمہ جیسا اس نے کیا ہے۔ کہا جاتا ہے۔ آج تک اس کا ثانی مشکل ہے۔ لیکن اس نے ایک عورت ذات یعنی "سیتا" کے ساتھ جو سلوک روا رکھا۔ اس کی وجہ سے آج تک ہندو لوگ اس کے مجسمہ کے دس سر بنا کر ان کے اوپر ایک گدھے کا سر بنا دیتے ہیں۔

ہٹلر بڑا بہادر ہے۔ سیاست دان ہے۔ بڑا منتظم ہے اور قابل ترین جرنیل ہے۔ لیکن ان چار سروں کے اوپر ایک گدھے کا سر یہ ہے کہ وہ بڑا ظالم اور جابر ہے۔

گذشتہ جنگ یورپ میں ہٹلر بطور ایک سپاہی کے فرانس کے میدان جنگ میں لڑتا رہا۔ قیصر جرمنی کی شکست کے بعد عہد نامہ ورسائی

کے ذریعہ اتحادیوں نے جرمنی پر تاوان ڈالا۔ اور اس کی فوج چند ہزار نفوس تک محدود کر دی۔ اور اس کی ملٹری حرکات کی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ ظاہراً جرمنی کی حیثیت ایک باجگزار ریاست سے بڑھ کر نہ تھی۔

اختتام جنگ یورپ پر پریزیڈنٹ امریکہ مسٹر ولسن کی تحریک کردہ چودہ نکات کے زیر اثر جو لیگ اقوام قائم کی گئی۔ اس میں جرمن نمایندوں کو لینا قبول نہ کیا گیا۔ اس لیگ اقوام کی شکل وصورت ایسی بنی کہ اس کے حقیقی محرک مسٹر ولسن کے اپنے ملک کا ریاستہائے متحدہ امریکہ نے بھی اس میں شامل ہونا پسند نہ کیا۔ خیر! بین الاقوامی لیگ اس وقت زیر بحث نہیں۔ ہمارا نفس مضمون ہٹلر ازم ہے جب جرمنی کی حالت اس قدر گر گئی۔ تو قدرتاً وہاں کئی ایک سیاسی پارٹیاں نمودار ہو گئیں جن میں باہمی برسر اقتدار ہونے کی جدوجہد شروع ہو گئی۔ ایسے وقتوں میں ہٹلر نے خفیہ سوسائیٹیاں قائم کر کے جگہ بجگہ ورزش گاہوں کے نام سے فوجی ٹریننگ کیمپ قائم کر لئے۔ اس کام کو اس خوبی سے اس نے چھپائے رکھا کہ باوجود اتحادیوں کی طرف سے کڑی نگرانی کے انہیں اپنی سرگرمیوں کی ہوا تک بھی پہنچنے نہ دی۔ جرمنی کی اقتصادی حالت اس قدر مخدوش ہو چکی تھی۔ کہ اس کے لئے تاوان ادا کرنا بالکل ناممکن تھا۔ چنانچہ اتحادیوں نے لیگ کی معرفت جرمنی کے علاقہ Rohr (روہڑ) پر جس میں کوئلہ کی کانیں واقع ہیں۔ اپنا قبضہ جما لیا۔ اور نادہندگی تاوان فرانس کے قبضہ میں سونپ دیا گیا۔ ہٹلر جہاں ایک طرف اپنے

ملک کی اندرونی سیاسیات میں بزورِ شمشیر انقلاب لانے کی خفیہ تیاریاں کر رہا تھا۔ وہاں فرانس کے رُوہڑ پر قبضہ کو نشپھل بنانے کے متعلق سازشوں میں بھی اس کا ہاتھ رہتا تھا۔ کئی سال کی خفیہ تیاریوں کے بعد جب ہٹلر کو کافی تعداد مسلح پیروکاروں کی مل گئی۔ تو اس نے نازی پارٹی قائم کی۔ نازی پارٹی نے پہلے پہل تو اپنے مخالفوں کو اقتصادی بہتری کی بنا پر اپیل کی اور کہیں کہیں اپنے سنگٹھن کے مسلح نظاروں سے مرعوب بھی کیا گیا۔ مگر جونہی ہٹلر ریشٹاگ کے انتخاب میں کامیاب ہو گیا۔ اور چانسلر بھی بن گیا۔ تو اس پارٹی نے اپنی سیاہ کارناموں کی شطرنج کا بساط بچھانا شروع کر دیا۔ پہلی چال تو اس نے یہ چلی کہ سارے ملک کی باگ دوڑ اپنی پارٹی کے قبضہ میں ہمیشہ کے لئے قائم رکھنے کے لئے مخالف پارٹیوں کے سرکردہ لیڈروں کو کسی نہ کسی بہانہ سے گرفتار کر کے جیلوں میں بند کرا دیا۔ اور پھر یکایک جیلوں کے اندر ہی بہت سوں کو ہٹلر نے خود یا اپنے دوسرے لفٹنٹوں کے ہاتھوں شوٹ کر یا کرا دیا۔ ان ظالمانہ کرتوتوں کی بدولت سارے ملک میں نازی پارٹی کا خوف ہراس چھا گیا۔ اور ہٹلر کا حکم بمنزلہ موت نہ ٹلنے والا بن گیا۔ ہٹلر نے جرمنی کی تمام منتشر دانہ طاقتوں کو اپنے رعب اور چالوں سے اپنی پارٹی کے ساتھ منسلک کر لیا۔ اور اپنے تدبر کا سکہ بٹھانے کے لئے سب سے اول غیر ملکی مخالفوں کے ساتھ اپنے علاقہ روہڑ کو آزاد کرانے کی جدوجہد شروع کی۔ جس میں اسے مکمل کامیابی ہوئی۔ اس سے جرمنوں

کے دلوں میں اس کے تدبر کا سکہ بھی جم گیا۔ ایسے حالات میں پھر اس نے ملکی سرمایہ کو اپنے ہاتھ میں لانے کے لئے دوسری چال چلی۔ اس نے نسلی پاکیزگی کا نعرہ بلند کیا۔ یعنی جرمن قوم خالص آرین نسل سے ہے اور اس کے تعلقات و رشتے ناطے غیر آرین نسلوں سے قانوناً بند کر دیئے۔ اس کی تہ میں جو سبب کام کر رہا تھا۔ وہ یہ تھا کہ گذشتہ جنگ کے وقت اور بعد میں بھی جرمنی میں یہودی لوگ سب سے زیادہ سرمایہ دار تھے۔ جہاں جرمن گورنمنٹ میں وہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے وہاں تجارتی میدان میں بھی سب سے بڑھے چڑھے تھے۔ اب اس نسلی پاکیزگی کی تحریک نے یہودیوں سے نفرت کی شکل اختیار کر لی۔ نوبت یہاں تک پہنچی۔ کہ یہودیوں کو بر سر عام قتل کر دینا۔ لوٹ لینا۔ بے عزت کرنا کوئی جرم نہ سمجھا جانے لگا۔ ایسے کرہ ہوائی میں ہٹلر نے تمام یہودیوں کو اولاً تو سرکاری ملازمتوں سے برطرف کر دیا۔ بعد ازاں انہیں بہ یک بینی و دو گوش جرمنی سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ بچاروں کی صدیوں کی کمائی اور پونجی کا تو کیا کہنا۔ سفر کے لئے زاد راہ تک بھی ہمراہ لے جانے کا ان کو موقع نہ دیا گیا۔ اس طرح یہودیوں کی دولت سنبھال کر ہٹلر نے سامان جنگ تیار کرنے کے کارخانہ جات تعمیر کر لئے۔ اور ساری قوم کو فوج کی شکل میں ڈھال لیا۔ اب تو ہٹلر فخریہ کہنے لگا۔ کہ German means a soldier یعنی جرمن کے معنی سپاہی کے ہیں۔ جو لڑنا نہیں جانتا۔ وہ جرمن نہیں۔

اس نے نسلی پاکیزگی کے اس جذبہ کو بطور ایک حقیقت ظاہر
کرنے کے لئے دو چار اور اقدام کئے۔ سب سے اول تو اس نے
اپنا قومی نشان "عقاب" کی بجائے۔ سوستکا (卐) مقرر کیا۔ سوستکا
وہ نشان ہے۔ جسے ہندو لوگ عموماً گنیش یا سوستکا کا نام دیتے ہیں
اور وہ جو دراصل آریہ لوگوں نے لفظ "اوم" جو خدا کا ذاتی نام ہے
اسے لکھنے کی ایک شکل اپنی ایجاد کر رکھی تھی۔ اس سے ہٹلر کا مطلب
پورانے آریوں سے اپنے رشتہ کے اظہار کا تھا چنانچہ بعد ازاں
اس نے اپنے ملکی درسگاہوں میں سنسکرت کی تعلیم بھی لازمی کر
دی۔ اور عورتوں کے لئے گھریلو کاروبار کا میدان ہی مخصوص کر دیا
دفتروں، بازاروں پولیس و فوج میں ان کی بھرتی بالکل بند کر دی گئی
کیونکہ ان کاموں کو عورتوں کے لئے غیر قدرتی خیال کیا گیا۔ اولاد
پیدا کرنا۔ بچپن سے لڑکپن تک اس کی پرورش کرنا۔ اور گھر کے دیگر
کاروبار کو بخوبی سرانجام دینے تک ہی عورتوں کا حلقہ اقتدار مقرر کر دیا
گیا۔ اور یہی عورتوں کے متعلق پورانا آرین تصوّر ہے

لڑکے اور لڑکیوں کے لئے تعلیم لازمی کر دی گئی۔ اور تعلیمی کورس
میں ملٹری ٹریننگ کو بطور لازمی مضمون کو داخل کر دیا گیا۔ مالی میدان
میں بھی اس پارٹی نے کافی سرگرمی دکھلائی۔ ایک سرمایہ دارانہ نظام
رکھتے ہوئے۔ اس میں حکومت کو ایسے اختیارات دے دئے گئے۔ جس
سے وہ بیکاری کو دور کرنے کے لئے نئے نئے کارخانہ جات قائم کرنے اور موجودہ

کارخانہ جات کے مالکوں کو مقررہ تعداد میں مزدوروں کو نوکر رکھنے مزدوری کی مقررہ شرح پر مزدوری ادا کرنے کے و اونکو دیگر سہولیت دینے اور تقسیم منافع کو کنٹرول کرنے تک کا اقدام کرسکے۔ اس سے کسی حد تک بیکاری و بے روزگاری کا انسداد بھی ضرور ہوگیا۔ لیکن یہ سب کام جبر وتخویف کی بدولت سرانجام پانے لگے۔ جس سے انفرادی آزادی بہت حد تک زائل ہوگئی۔ انسانی روح جو اپنے جسم اور اندرونی قوا کی ترقی کے لئے آزاد روی کی قدرتاً خواہشمند رہتی ہے۔ اس کے لئے حصول مقصد کا کوئی موقع نہ رہا۔ بنوک شمشیر اپنے احکامات کی تکمیل کروانے کی وجہ سے آزادی خیالات کو بھی دبنا پڑا۔ اس طرح انسان و انسانیت کی حفاظت کے مسئلہ کو کہ جس حقیقی مقصد کے لئے دنیا میں حکومتوں کے قیام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہتھیار بند لفنگوں کے رحم پر چھوڑ دیا گیا۔

اس طرح اپنے ملک میں سیاسی۔ اقتصادی اور مجلسی میدان میں بنیادی تبدیلیاں اپنے حسب منشاء پیدا کر کے نازی پارٹی نے جرمنی میں اپنا مکمل اقتدار جمالیا۔ جب تمام ملکی روپیہ ذرائع اور آدمی ہٹلر کی مٹھی میں آگئے۔ تو اس نے آسٹریا کو اپنے علاقہ میں شامل کرلیا۔ اور سلوویکیا کو اپنے ساتھ ملانے کی جدوجہد شروع کردی۔ دینا میں یہ ظاہر کیا گیا۔ کہ گذشتہ جنگ یورپ سے پہلے جو جرمنی کی حالت تھی۔ وہی دوبارہ قائم کرنا۔ ان کا مقصد ہے۔ اور ورسائی کے عہدنامہ کے ذریعہ جو

جو علاقہ جات اس سے چھن گئے ہیں۔ ان کو بذریعہ صلح یا جنگ واپس لے کر دم لیں گے۔ سالم چکوسلاویکیہ پر قبضہ اور پھر پولینڈ سے ڈنزگ۔ کی بندرگاہ اور اس علاقہ کا مطالبہ جو پرشیا کو مغربی جرمنی سے جوڑتا ہے۔ بالکل اس دعوے کی حدود سے تجاوز تھا۔ یعنی جس دعوے کی بنا پر موجودہ جنگ کی تحریک کی گئی تھی۔ اس کی تردید اپنے پہلے ہی عملی اقدام میں جرمنوں نے کر دی۔ اس کے بعد تو جو کچھ ہوا۔ وہ اندھوں پر بھی ہٹلر اور نازیوں کے اندرونی ارادوں کی تصویر آشکارا کر دیتا ہے۔ اپنے تمام پرانے اور نئے عہد ناموں کی خلاف ورزی کر کے بغیر جانبدار ممالک پر جس طرح قبضہ جمایا گیا۔ اور ناروے۔ ڈنمارک ہالینڈ۔ بلجیم اور فرانس کی بالترتیب فتح نے نازیوں کے ساری دنیا پر حکمران ہونے کے منصوبوں کا بھانڈا پھوڑ دیا ہے۔ صرف یورپ اور افریقہ کو ہی نہیں بلکہ جرمنی امریکہ اور ایشیا کو بھی اپنی حکومت کے مزے چکھانے کی فکر میں ہے۔

دنیا کے تختہ پر اس وقت جس قدر حکومتیں نازیت کے ساتھ لوہا لینے کی ہمت رکھتی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ روس۔ اٹلی۔ انگلستان۔ جاپان امریکہ ان ممالک میں باہمی گٹھ جوڑ ہو چکے یا ہونے والے ہیں۔ ان میں سے روس کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے۔ کہ آخرکار جرمنی اور روس میں ایک دن جنگ ہو کر رہے گی۔ کیونکہ ان کی حکومتوں کے نظام متضاد قسم کے ہیں۔ موجودہ جنگ کے آغاز سے کچھ عرصہ پہلے بھی دنیا اس قسم کی غلط فہمی

میں مبتلا تھی۔ روس اور جرمنی کے معاہدہ نے اس غلط فہمی کو کسی قدر تو رفع کر دیا۔ لیکن ہٹلر نے (Mein Kampf) "میری جدوجہد" نامی اپنی کتاب میں اس کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی رہی سہی بھی دور ہو جانی چاہیئے۔ ہٹلر نے لکھا ہے کہ روس کی سوشلزم اور جرمنی کی سوشلزم میں صرف ایک قدم کا فرق ہے۔ روس کی سوشلزم وسیع اور ساری دنیا کے لئے ہے۔ ہماری سوشلزم محدود اور نیشنل ہے۔ یعنی ہماری قوم تک محدود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ روس اور جرمنی کی لازمی ٹکر کے متعلق جو خیالات پائے جاتے ہیں۔ وہ مضبوط دلائل کی بنا پر نہیں۔ یہ خیال صحیح ہو یا غلط میرا مطلب تو صرف یہ واضح کرنا ہے۔ کہ اس گٹھ جوڑ میں ایک زبردست ٹکر ہونا لازمی ہے۔ ایک گروہ کے ممبر جرمنی۔ اٹلی۔ روس اور جاپان یا محض جاپان ساری دنیا کو زیر کر کے ایک مشترکہ سرمایہ کی فرم کے طور پر روئے زمین کے ممالک پر اپنی حکومتی کاروبار کو چلانے کے خواب دیکھ رہے ہیں دوسری طرف امریکہ، انگلستان اور روس سمیت یا بغیر اس کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ ان میں کسے کامیابی ہو گی۔ یہ کہنا ہمارے نفسِ مضمون سے تعلق نہیں رکھتا۔ اتنا تو عیاں ہے۔ کہ خواہ کوئی کامیاب ہو۔ یہ کامیابی ہتھیار بند قوتوں کی ہو گی۔ اور اسی کو میں ہٹلر ازم کا نام دیتا ہوں۔

گاندھی ازم

"گاندھی ازم" اس راج نیتی کا نام ہے۔ جسے موہن داس کرمچند گاندھی المعروف مہاتما گاندھی نے سیاسیات ہند میں رائج کر رکھا ہے گاندھی جی کے نام اور کام سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ ان کے سیاسی مسلک کا نچوڑ ستیہ اور اہنسا ان دو الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہی ان کا دھرم و ایمان اور یہی ان کی راج نیتی ہے۔ اور اسی کو ہی "گاندھی ازم" کہنا روا ہو گا۔

گاندھی ازم کوئی زبانی جمع خرچ کی بات نہیں ہے۔ اس نے ہندوستان چھوڑ ساری دنیا کے سیاسیات میں اپنے لئے پوزیشن حاصل کر لی ہے۔ یوں تو گاندھی جی کے نام اور کام سے بچہ بچہ واقفیت رکھتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر "گاندھی ازم" کی سیاسی اہمیت سے بہت کم واقفیت پائی جاتی ہے۔ لہٰذا اس کی وضاحت میں چند سطور حوالہ قلم کرنا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

گاندھی جی کا مکمل نام موہن داس کرمچند گاندھی ہے۔ آپ گجرات (کاٹھیاواڑ) کی ریاست راجکوٹ کے دیوان کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ نے لندن میں جا کر بیرسٹری کا امتحان پاس کیا ہوا ہے۔ اور بطور بیرسٹر وکالت بھی کرتے رہے ہیں۔ آپ نے اپنی زندگی کے اوتار چڑھاؤ کے حالات اپنی خود تحریر کردہ سوانح حیات میں بہت اچھے طریقے پر قلمبند

کئے ہیں۔ جن واقعات کا ذکر اس میں ہے۔ اس کو پڑھ کر ناظرین کے دل پر اس کی سچائی اور اہنسا کے بلند پایہ جذبات کا اثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اپنے متعلق بعض ایسی باتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں جنہیں خفیہ رکھنے کے لئے یا ظاہر نہ کرنے کے لئے لوگ کئی ایک قسم کے جتن اور اوپائے کرتے ہیں۔ اور کئی ایک قسم کے اخراجات بھی برداشت کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ انہیں خود مشتہر کرنے کی جرات اور بیخوفی تو کسی کسی کے ورثہ میں آئی ہے۔ اپنی زندگی کی اس سرگذشت کا نام بھی آپ نے "میرے تجربات صداقت" رکھا ہے۔ غرضیکہ اس کی ایک ایک حرکت میں سچائی اور اہنسا کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے کھاتے پیتے۔ بیٹھتے، اُٹھتے، سوتے جاگتے۔ چلتے پھرتے، لکھتے اور بولتے ہر حالت میں آپ اُنہیں اسی رنگ میں رنگے ہوئے دیکھیں گے۔ گاندھی جی کی ذاتی صفات اور اس کی سرگذشت زندگی اتنی اور ایسی ہیں۔ کہ ہر ایک شخص کو اس کے مطالعہ سے سبق حاصل ہو سکتا ہے۔ مگر آج میرے مضمون کا تعلق اُن کی ذات کی بجائے ان کی سیاسیات سے ہے۔ یعنی گاندھی کی بجائے گاندھی ازم سے ہے۔

آپ کی سیاسی دنیا میں آمد پہلے پہل جنوبی افریقہ میں ہوئی۔ جنوبی افریقہ کی یونین گورنمنٹ نے جب غیر ملکی لوگوں کی افریقہ میں درآمد کو روکنے کی غرض سے چند ایک قوانین پاس کئے جو ہندوستانیوں کے لئے خصوصاً ذلیل کن تھے۔ تو ان کے خلاف گاندھی جی نے

جو اس وقت جنوبی افریقہ میں بطور بیرسٹر پریکٹس کیا کرتے تھے۔ آواز اٹھائی۔ آواز ہی نہیں بلکہ ستیہ گرہ کی تحریک چلائی۔ اس وقت کی آپ کی تحریک کو خاموش مقابلہ (Civil Resistence) کا نام دیا گیا۔ اس وقت آنجہانی مسٹر گوکھلے زندہ تھے۔ اور صرف وہی ہندوستان میں گاندھی جی کی تحریک کے حامی و معاون تھے۔ آنجہانی مہاتما منشی رام جو بعد میں سوامی شردھانند کے نام سے مشہور ہوئے۔ اس وقت گورو کل کانگڑی کے گورنر تھے۔ چنانچہ انہوں نے اور گورو کل کے برہمچاریوں نے محنت مزدوری کرکے اور اپنی خوراک کی بچت سے روپیہ کی بھی کچھ امداد کی تھی۔ حقیقتاً ہندوستان کی امداد کوئی خاص امداد نہ تھی۔ ہاں ایک اخلاقی امداد ضرور تھی۔ ہندوستان تو کیا دنیا بھر میں خاموش مقابلہ کا یہ سب سے پہلا موقع تھا۔ ایک ہتھیار بند حکومت کا بغیر ہتھیاروں کے مقابلہ کرنا کوئی معمولی بات نہ تھی۔ مہاتما جی کو کئی سال کی کڑی مصیبتوں اور جیل و بند کی صعوبتوں کا مزہ چکھنا پڑا۔ صرف گاندھی جی ہی نہیں۔ بلکہ آپ کی دھرم پتنی ماتا کستورہ بائی اور آپ کے خاندان کے دوسرے ممبر بھی جیل و بند سے بچ نہ سکے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا جب آپکو (Shot) گولی ماردی گئی۔ اور آپ کو مردہ سمجھ کر چھوڑ کر حملہ آور بھاگ گئے۔ اس وقت آپ کی جان ایک یورپین ڈاکٹر نے سیوا کرکے بچائی۔ لیکن اس واقعہ کے بعد بھی آپ نے پہلے سے بھی زیادہ زور و شور کے ساتھ اپنی تحریک کو شروع رکھا۔ حتیٰ کہ آخر کار یونین

گورنمنٹ کو نیچا دیکھنا پڑا۔ انہیں گاندھی جی کے ساتھ صلح کرتے ہی بنی۔ ذلیل کن قواعد کو تبدیل کرنا پڑا۔ اور گاندھی جی کے ساتھ ایک دستاویز کے ذریعہ تحریری سمجھوتہ کیا گیا۔ اس دستاویز کا نام گاندھی سمٹس ایگریمنٹ (Gandhi Smuts agreement) ہے۔

اس واقعہ سے گاندھی جی کی شخصیت کا بطور سیاسی رہنما ہندوستان میں بھی چرچا پھیل گیا۔ آپ نے جنوبی افریقہ کی اس جدوجہد میں ستیاگرہ کے چند اصول وضع کر لئے۔ اور ان پر غور کرنے کے بعد آپ اسی ہتھیار سے ہندوستان کو بھی آزاد کرانے کے خیال سے ۱۹۱۴ء میں ہندوستان واپس لوٹ آئے۔

ہندوستان میں آپ کی آمد کے موقع پر یہاں انڈین نیشنل کانگرس ہی ایک ایسی جماعت تھی۔ جو سیاسی جدوجہد چلانے کی دعوے دار تھی اس پر ماڈریٹ پارٹی کا غلبہ تھا۔ جس کے لیڈر سر سریندر ناتھ بینرجی سر فیروز شاہ مہتہ مسٹر جناح اور سر تیج بہادر سپرو سر کھے لوگ تھے لوکمانیہ تلک۔ لالہ لاجپت رائے۔ مسٹر بپن چندر پال سر کھے انسان جو انتہا پسند لیڈر خیال کئے جاتے تھے۔ وہ الگ تھلگ بیٹھے ہوئے تھے۔ گاندھی جی کی واقفیت اگرچہ کانگرسی لیڈران سے تھی۔ کیونکہ وہ کانگرس کے اجلاس کلکتہ میں ۱۹۰۱ء میں پہلے پہل شمولیت کر چکے تھے۔ اور بعد ازاں ان کے تعلقات لیڈران کانگرس سے بدستور چلے آتے تھے لیکن ہندوستان میں آکر انہوں نے اپنے خیالات کے حامی کہیں

نہ پائے۔ آپ خاموشی سے حالات کا مطالعہ کرتے رہے۔ اتنے میں ضلع کھیرہ (گجرات) کے کسانوں میں زمین کے لگان کے متعلق بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ گاندھی جی نے اس میں اپنا ہاتھ ڈالا۔ کسانوں نے بھی ان کی رہنمائی قبول کر لی۔ گاندھی جی نے وہاں بھی ستیاگرہ کا ہتھیار چلایا۔ جس کے ذریعہ گاندھی جی کی فتح اور گورنمنٹ کو شکست ہوئی۔ اس واقعہ سے گاندھی جی کے ستیاگرہ کی شہرت ہندوستان میں پھیلنے لگی۔

کچھ عرصہ کے بعد بہار کے صوبہ کے چمپارن ضلع میں نیل کے گورے کاشتکاروں اور ان کی رعیت کے درمیان کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مہاتما گاندھی جی اس کے حل کے لئے چمپارن تشریف لے گئے۔ چمپارن کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے آپ کو ضلع چھوڑ دینے کا آرڈر دیدیا۔ جس کی تعمیل کرنے سے گاندھی جی نے انکار کر دیا۔ آخر کار کمشنر کے حکم سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ اور بعد ازاں گاندھی جی کی وساطت سے وہ معاملہ رعیت کی خواہش کے مطابق آپس میں سمجھوتہ سے طے پا گیا۔ ان دنوں اینگلو انڈین پریس نے گاندھی جی کے خلاف سخت توہین آمیز پروپیگنڈہ کیا۔ مگر گاندھی جی نے ان کا کوئی جواب نہ دے کر خاموشی سے اپنا کام سرانجام دیا۔ اس سے ان کے ستیاگرہ کے ہتھیار کی اہمیت لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے لگی۔ اور آپ کی شہرت کو ہندوستان میں چار چاند لگ گئے۔

اس زمانہ میں یورپین جنگ جاری تھا۔ اور مہاتما گاندھی ان دنوں برطانیہ کی امداد کر رہے تھے۔ لہذا ۱۸-۱۹۱۴ء تک تو اِدھر اُدھر کی شکایات کو رفع کرانے تک ہی گاندھی جی نے اپنی جد و جہد کو محدود رکھا۔ مگر ۱۹۱۸ء میں جب جنگ میں کئے گئے وعدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے گورنمنٹ نے بجائے ہندوستان کو درجہ نوآبادیات دینے کے وائسرائے کی کونسل میں رولٹ ایکٹ نامی کالا قانون پاس کر دیا تو اس پر گاندھی جی نے اپنی تحریک ستیاگرہ کو جاری کرنے کا ارادہ کر لیا۔ جگہ بہ جگہ ستیاگرہ کمیٹیاں قائم کی گئیں۔ مگر ستیاگرہ شروع کرنے سے پہلے آپ نے ایک آل انڈیا ہڑتال ۶/۴/۱۹۱۹ کو منانے کا دن مقرر کیا۔ جس میں رولٹ ایکٹ کے خلاف اظہار مذمت کے لئے جلسے و جلوسوں کے انتظامات کئے گئے تھے۔ شروع کرنے سے پہلے آپ وائسرائے کے ساتھ ملاقات کرنے اور اپنے مطالبات پیش کرنے کے لئے دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر راستہ میں ہی آپ کو پلول سٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا۔ اس ایکٹ کے ایجی ٹیشن کے سلسلہ میں پنجاب میں مارشل لاء کا اعلان ہوا۔ اور امرتسر میں جلیانوالہ کا حادثہ ظہور میں آیا۔ آخر کار گورنمنٹ کو رولٹ ایکٹ کو ایک مردہ قانون تصور کرنا پڑا۔ اور گاندھی جی و دیگر لیڈروں کو بغیر شرط رہا کرنا پڑا۔ یہ یہ رہائیاں اس وقت عمل میں آئیں۔ جبکہ انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس امرتسر میں منعقد ہونے والا تھا۔ اسی اثناء میں مانٹیگو

چیمسفورڈ اصلاحات کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ اور امرتسر کے اجلاس میں کانگرس لیڈروں میں ان اصلاحات کو منظور یا نامنظور کرنے پر زبردست مباحثہ ہوا۔ جس کی وجہ سے اجلاس دو روز اور لمبا ہو گیا۔ تاہم آخرکار کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اس مباحثہ میں لوکمانیہ تلک۔ مسٹر جناح۔ لالہ لاجپت رائے۔ مسٹر سی داس اور بپن چندر پال ایک طرف اور مہاتما گاندھی۔ پنڈت موتی لال نہرو دوسری طرف تھے۔ اس معاملہ کے فیصلہ کرنے کے لئے ماہ ستمبر ۱۹۲۰ء میں ایک خاص اجلاس کلکتہ میں زیر صدارت لالہ لاجپت رائے منعقد ہوا۔ جس میں مہاتما گاندھی کا ریزولیوشن تسلیم کیا گیا۔ اس وقت سے لے کر مہاتما گاندھی کا طوطی کانگرس میں بولنے لگا۔ ماہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں کانگرس کے معمولی اجلاس میں جو ناگپور میں زیر صدارت شری ویت وجے راگھو آچاریہ منعقد ہوا تھا۔ گاندھی جی نے کانگرس کریڈ میں تبدیلی کرا دی۔ جہاں پہلے کانگرس کریڈ میں "تمام پُرامن اور قانونی ذرائع سے سیلف گورنمنٹ حاصل کرنے کے الفاظ تھے" وہاں "تمام جائز اور پرامن ذرائع سے سوراجیہ حاصل کرنا" الفاظ رکھے گئے۔ یہ ایک آخری چوٹ تھی جس کو ماڈریٹ لیڈر برداشت نہ کر سکے۔ اگرچہ مہاتما گاندھی جی کی آمد سے ہی وہ بے چین سے ہو رہے تھے۔ مگر اب تو ان کے لئے سوائے الگ تھلگ ہو جانے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔ اب قانونی ذرائع کی جگہ جائز ذرائع پاس کرا کے گاندھی جی نے اپنا شانتی مئی نان وائلنس کا پروگرام بھی ناگپور اجلاس میں پاس

کروالیا۔ اجلاس کے ختم ہوتے ہی گاندھی جی کو لیڈر مقرر کردیا گیا اور آپ نے ایک کروڑ روپیہ اور ایک کروڑ ممبران کانگرس کے لئے اپیل کی۔ اور ساتھ ہی سہ گونہ بائیکاٹ یعنی بدیشی مال خصوصاً بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ۔ سکولوں و کالجوں کا بائیکاٹ۔ عدالتوں۔ کونسلوں اور سرکاری ملازمتوں کا بائیکاٹ بھی شروع کردیا۔ اس پروگرام پر عمل کرنے سے سارے ملک میں جاگرتی اور بیداری پیدا ہوگئی۔ کانگرس کمیٹیوں کا جال ملک میں ہر جگہ کانگرس تاریخ میں پہلی بار بچھایا گیا۔ اس ایک کروڑ روپیہ نے وہ کام کرکے دکھایا۔ جو اربوں جمع کرنے پر بھی ناممکن تھا۔ آزادی کا چرچا گھر گھر ہونے لگا۔ بچے۔ نوجوان اور بوڑھوں تک ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار ہو گئے۔ یہاں تک کہ تیس ہزار تک آدمی جیلوں میں خوشی خوشی چلے گئے۔ لوگوں میں جوش کا یہ عالم تھا۔ کہ چاروں طرف گاندھی کی جے۔ بندے ماترم اور سوراجیہ ہمارا پیدائشی حق ہے کے نعروں سے زمین و آسمان گونج اٹھے اس سہ گونہ بائیکاٹ کے ساتھ ساتھ گاندھی جی نے چرخہ اور کھدر کے پرچار اور اچھوت اودھار ۔ ہندو مسلم اتحاد کے تعمیری پروگرام کو بھی ساتھ جوڑ دیا۔ ابھی ستیاگرہ کی پہلی سیڑھی عدم تعاون کو ہی شروع کیا تھا۔ اور دوسری سیڑھی سول نافرمانی تک نوبت نہ پہنچی تھی۔ کہ چوراچوری میں ایک واقعہ ہوگیا یعنی یو۔پی میں ایک مقام چوراچورا نامی پر کسانوں کا ایک جلسہ ہو رہا تھا۔ اس جلسہ کے دوران میں پولیس نے ایک کانگرسی ورکر کو گرفتار

کرلیا۔ پھر کیا تھا۔ وہ کسان سخت اشتعال میں آگئے اور آگ بگولہ ہو کر لٹھ لے کر پولیس والوں پر پل پڑے۔ پولیس والے بھاگ کر تھوڑی دور پر پولیس تھانہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ انہوں نے ان کا پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور تھانے کے دروازوں کو توڑنے لگے۔ آخر کہیں سے تیل کے پیپے لا کر تھانے کو آگ لگا دی۔ جس میں چند کنسٹیبل اور پولیس سب انسپکٹر بھی جل گئے۔ اس واقعہ نے گاندھی جی کو اتنا صدمہ پہنچایا کہ انہوں نے اپنی تحریک کو فوراً روک دیا۔ اور اس واقعہ کی تحقیقات کرائی۔ واقعہ سچا ثابت ہونے پر فوراً والنیٹیر کوروں کو توڑ دیا گیا۔ جدوجہد کے اس مرحلہ پر اگرچہ بہت سے لیڈر ان تحریک کو بند کرنے کے خلاف رائے رکھتے تھے۔ مگر گاندھی جی اپنی تحریک میں تشدد کا ایک شائبہ تک بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ آخر کار اس تحریک کو ملتوی کرنا پڑا۔

بعد ازاں کانگرس میں ایک سوراجیہ پارٹی نمودار ہوگئی۔ جس کے لیڈر مسٹر سی۔ آر داس و پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ وہ کونسلوں کے بائیکاٹ کو منسوخ کرا کے۔ کونسلوں کے اندر سے روکاوٹ پیدا کرنے کے پروگرام کو چلانا چاہتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں گیا کانگرس کے موقع پر جبکہ مسٹر سی۔ آر داس پریذیڈنٹ تھے اس پارٹی کی بنیاد ڈالی گئی گاندھی جی جیل میں تھے۔ ان کی غیر حاضری میں بھی اون کا اس قدر عوام میں رسوخ تھا۔ کہ مسٹر سی۔ آر داس کی صدارت میں بھی کانگرس نے ان کے ریزلیوشن کو پاس نہ کیا۔ آخر کار سی۔ آر داس کو مستعفی ہونا پڑا۔

چنانچہ گاندھی جی نے جیل سے واپس آتے ہی پہلا کام یہ کیا۔ کہ مسٹر سی۔ آر داس اور پنڈت موتی لال نہرو کی صداقت پر بھروسہ رکھتے ہوئے کانگرس میں ان کی پارٹی کو شامل کر کے ان کے پروگرام کو آزمانے کا موقع دیدیا۔ آخر کار ۱۹۲۹ء کو لاہور کانگرس کے اجلاس کے موقع پر جو پنڈت جواہر لال نہرو کے زیر صدارت ہو رہا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے صاف اعلان کر دیا۔ کہ ہماری کونسلوں کے اندر جا کر کام کرنے کی سکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اب ہم پھر مہاتما گاندھی جی کی زیر رہنمائی کام کرنے کو تیار ہیں۔ اس اجلاس میں سوراجیہ کی بجائے مکمل آزادی کے الفاظ بھی کانگرس کریڈ میں شامل کر لئے گئے۔

۱۹۳۰ء کے شروع میں ہی گاندھی جی نے پھر ستیا گرہ کی تیاری حصول آزادی کے مقصد سے شروع کر دی۔ چنانچہ اب کے آپ نے سب سے پہلے ہی قدم پر سول نافرمانی کا پروگرام ملک کے سامنے رکھا مارچ کے مہینہ میں ڈانڈی سے مہاتما جی نے اپنے ۷۲ ساتھیوں کے ساتھ نمک کا قانون توڑنے کے لئے کوچ کیا۔ بعد ازاں ملک میں جو پر امن دور شروع ہوا۔ وہ ہندوستان کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ نہایت خاموش اور شانتی سے باوجود کئی ایک قسم کے اشتعالوں کے ایک لاکھ کے قریب ستیا گرہی جیلوں میں جا بسے۔ آخر کار گورنمنٹ کو گاندھی جی اور کانگرس کے مطالبہ مانتے ہی

بن پڑی۔ اس وقت والسرائے لارڈ ایرون (موجودہ لارڈ ہیلیفیکس) تھے۔ اور انہوں نے گاندھی جی کے ساتھ برطانوی گورنمنٹ کی اجازت سے ایک پیکٹ کیا۔ جس میں ہندوستان میں ذمہ دار گورنمنٹ قائم کرنے کے متعلق کانسٹی ٹیوشن تیار کرنے کیلئے۔ لندن میں ایک گول میز کانفرنس بلائی جانے کا مطالبہ منظور کیا گیا۔ دوسرا سول نافرمانی و پکٹنگ کا حق بھی تسلیم کر لیا گیا۔ اس کے بعد گول میز کانفرنس میں جو کچھ ہوا۔ وہ گاندھی جی کے کسی فعل کردنی یا ناکردنی کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنوں کی سازش سے گاندھی جی کو دہوکہ دیا گیا۔ گاندھی جی نے دھوکہ نہیں کھایا۔ لیکن ان کے ستیہ اور اہنسا کی ایک بار اور جانچ کرنے کے لئے گورنمنٹ ہند نے گاندھی جی کے وہاں سے واپس آتے ہی ان کو دوبارہ گرفتار کر لیا۔ اس پر پھر کانگرس نے ستیاگرہ شروع کر دیا۔ اور آخرکار گاندھی جی نے جس طرح اپنے آتمک بل سے جیل رہائی حاصل کی۔ وہ کسی سے چھپی نہیں۔ گاندھی جی کے ستیاگرہ کا یہ اثر ضرور ہوا۔ کہ برطانوی گورنمنٹ کو ہندوستان میں کم از کم صوبجاتی آزادی دینی پڑی۔ جیسا کہ موجودہ حالات میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجروہ ۱۹۳۵ء پر عمل ہو رہا ہے۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے قبل کمیونل ایوارڈ کے فیصلہ کے خلاف جس میں اچھوتوں کو ہندوؤں سے الگ فرقہ قرار دیدیا گیا تھا۔ مہاتما جی نے جیل میں بند رہتے ہوئے بھی اپنے "مرن برت" کے ذریعہ ایک ایسا

روحانی کرشمہ دکھلایا۔ جس سے گورنمنٹ برطانیہ کو مجبوراً اچھوتوں کو دوبارہ ہندوؤں کے اندر شامل کرنا پڑا۔ ایک مقتدر گورنمنٹ کے فیصلہ کو تبدیل کرانا۔ جبکہ وہ ارادتاً بطور سیاسی پالیسی کے عمل میں لایا گیا ہو۔ مسلح بغاوت سے بھی مشکل ہوتا ہے۔ لیکن بغیر خون کا ایک قطرہ گرائے بلکہ کسی کے دل کو ٹھیس تک لگائے بہایت پر امن طور پر اس تبدیلی کو عمل میں لے آنا ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔

اس جدوجہد کے دوران میں گاندھی ازم کا ڈائرہ ہندوستان سے باہر نکل کر دیگر ممالک تک جا پہنچا۔ انگلینڈ اور خصوصاً امریکہ میں بہت سے لوگ گاندھی ازم میں دلچسپی لینے لگے۔ نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ موجودہ جنگ کے آغاز میں جب کہ امریکہ کے ان لوگوں کی تعداد معلوم کی گئی۔ جن کو اصولاً جنگ" پر اعتراض تھا۔ تو ان کی تعداد ۶۰۰۰۰ ہزار تک پہنچ گئی۔ امریکہ میں ہر درجہ کے سیاست والوں بیوپاریوں اور علم و ادب کے ماہروں و پادریوں وغیرہ میں "گاندھی ازم" خوب اشاعت پذیر ہے۔ اگر گاندھی جی رضامند ہوتے۔ تو امریکن لوگ بخوشی ان کا امریکہ میں استقبال کرنے کو تیار ہیں۔ امریکیوں کے دلوں میں ہتھیار بند جنگ سے نفرت ہے۔ اور اگر کہیں گاندھی جیسا رہنما ان کے ملک میں ہوتا۔ تو وہ کب کے اس ڈائن سے نجات حاصل کر چکے ہوتے۔

مذکورہ بالا چند سطور میں میں نے آپ کو بتانے کی کوشش کی ہے

کہ گاندھی جی کا ستیاگرہ کا ہتھیار جہاں جہاں آزمایا گیا ہے۔ وہاں وہاں اسے نمایاں کامیابی ہوئی ہے۔ اب تو یہ ہتھیار ہندوستان کی حدود کو پار کر چکا ہے، اور آپ دیکھیں گے۔ کہ اس تباہ کن جنگ کے خاتمہ پر اس کی حمایت اس قدر بڑھ جائیگی کہ یہ پھر کسی سے روکے نہ رکیگی۔ اس وقت دنیا ہٹلر ازم کا نعرہ چکھ رہی ہے۔ اور ادہر گاندھی ازم بھی اپنے پریم بھرے بازو پھیلا رہی ہے۔ بموں اور گولیوں کی مار سے تنگ آئی ہوئی دنیا آخر اس پریم بھری آغوش میں آکر ہی آرام پا سکتی ہے۔ تباہ و برباد شدہ دنیا کو سوائے آرام کے اور کس چیز کی ضرورت ہے؟ ہاں! ہٹلر ازم کے متوالے۔ اپنی جھوٹی فتح و غرور کے نشے میں سرشار ایک دفعہ ضرور اپنے خنجر کا وار پانی جیسی ٹھنڈی اور نرم گاندھی ازم پر کریں گے۔ لیکن پانی پر تلوار کے وار کا نتیجہ سوائے تلوار زن کی تھکاوٹ کے اور کچھ نہیں۔ آخر کار تھک کر اور نادم ہو کر اسے اپنے جوش و خروش کو اسی ٹھنڈے جل سے شانت کرنا ہوگا۔ لہذا ہٹلر اور گاندھی کی جنگ کے لئے لوگوں کو تیار رہنا چاہیئے۔ وہ نہایت ہی مبارک دن ہوگا۔ جب ان دونوں طاقتوں کا مقابلہ ہوگا کیونکہ اس کے بعد دنیا کو آرام کا سانس لینے کا موقع مل سکے گا۔

باب اول

مشکلات کیا ہیں؟

گاندھی ازم ہماری مشکلات کا حل پیش کرتی ہے۔ اس امر کو واضح کرنے کے لئے باب اول میں مشکلات کی تشریح کی گئی ہے اور باب دوم میں انہی مشکلات کے حل پیش کئے گئے ہیں۔

مضمون ۱

مذہبی توہمات

ہندوستان کی ذہنی کیفیت اس وقت یہ ہے۔ کہ یہاں مذہبی تعصبات و توہمات کا بڑا زور ہے۔ یہاں ہر معاملہ کو خواہ وہ سیاسی ہو یا مجلسی مذہبی عینک سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ یہاں کی سیاسی اور اقتصادی الجھنوں میں بھی مذہب کا ہاتھ ہے۔ لفظ مذہب کے سب سے سادہ معنے آستکتا یعنی خدا پرستی ہو سکتے ہیں۔ تعداد تو ساری دنیا میں اس وقت خدا پرستوں

کی ناستکوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ مگر جو درجہ مذہب کو ہندوستانیوں کی زندگی میں حاصل ہے۔ وہ اور کہیں نہیں دکھائی دیتا۔ اس وقت اتحادیوں اور جرمنی میں جنگ جاری ہے۔ اتحادیوں نے اپنی سلطنت میں پرماتما سے اپنی فتح کی دعا کے لیئے ایک دن مقرر کیا۔ اس دن بھی چند گھنٹے اس کام میں صرف کئے۔ اور پھر خدا سے واسطہ چھوڑ کر اپنے کام میں لگ گئے۔ مگر ہندوستان میں وہ سارا دن تو دعاؤں اور پراتھناؤں میں گذرا ہی تھا۔ بعدازاں لوگ اپنے اپنے دائرہ اثر کے مطابق ہون یگیہ کرنے لنگر لگانے غریبوں میں خیرات تقسیم کرنے وغیرہ میں باقاعدہ طور پر لگ گئے ہیں۔ جہاں دوسرے ممالک اپنی اپنی حفاظت کے لیے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ وہاں ہندوستانی سب کاروبار کو چھوڑ کر اپنے اپنے معبود کو رجھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ ہندوستان کی ذہنی کیفیت کی زندہ مثال ہے۔ یہاں پر دیگر معاملات میں مذہبی اختلافات کے رہتے ہوئے بھی اس بات پر سب کا اتفاق ہے۔ کہ ہماری مشکلات کی واحد وجہ خدا کی ناراضگی ہے۔ سکھ و ہندو کا یقین ہے۔ کہ "بنا حکم ہے نہیں پاتا"۔ "رام بھروسے بیٹھ کے رہو کھاٹ پر سوے۔ ان ہونی ہونی نہیں ہونی ہوئے سو ہوئے"۔ مسلم کا یقین ہے۔ کہ خدا ہی سب کا رازق ہے اور جو مصائب آتی ہیں۔ وہ سب "قہر الہی" ہے۔ لہذا جب کوئی مشکل درپیش ہو تو ہندو مندر میں پرارتھنا کرتا۔ چڑھاوے چڑھاتا اور دیوی دیوتاؤں کی مدد اس کو حل کرنے کے لئے مانگتا ہے۔ سکھ گرنتھ صاحب کا سپتاہک

یا اکھنڈ پاٹھ رکھوانا۔ اردا سہ سودھتا ہے۔ مسلم مسجدوں میں سربسجود ہونا پیروں کی منتیں ماننا۔ گنڈا تعویذ پر اپنی مشکلات کے حل کے لئے تقوے رکھتا ہے۔ کچھ لوگ جو مغربی تعلیم سے بہرہ اندوز ہیں۔ اگرچہ یقین کے نقطہ خیال سے ڈانوا ڈول ہیں۔ مگر چونکہ ان کی تعداد بہت کم ہے لہذا عوام الناس میں اپنے رسوخ کو بنائے رکھنے کے خیال سے وہ اپنی نئی روشنی کے مطابق دوسروں کو تلقین کرنے سے کتراتے ہیں۔ عملی طور پر حالت جوں کی توں چلی آتی ہے۔ لوگ خدا کے بھروسہ پر کاہل اور سست ہو رہے ہیں۔ حیرانی تو یہ ہے۔ کہ جن لوگوں کی وہ بطور مذہبی ہیرو و رہنما قدر کرتے ہیں۔ اُن کی مثال کی پیروی کرنا بھی اپنے لئے فرض خیال نہیں کرتے۔ انہیں وہ خدا کا بیٹا یا محبوب اور منظور نظر یا مقبول قرار دے کر اپنے سے جدا ایک اعلےٰ جماعت کے ممبر قرار دے دیتے ہیں۔ اور پھر اپنے لئے اس کی برابری کی کوشش کرنا ایک گستاخی مانتے ہیں نتیجہ یہ ہے۔ کہ کوئی بھی ذمہ داری کا کام ہم اپنے کندھوں پر لینے کو تیار نہیں۔ ہاں معمولی معمولی سے مذہبی اختلافات کو بڑھا کر باہمی چپقلش و کشمکش کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔ یہ ایک غلامانہ ذہنیت ہے۔ جس کو مذہبی توہمات نے پیدا کیا ہے۔ اور جسے سیاسی غلامی نے مضبوط بنا دیا ہے۔

جنگی ذہنیت

آج سے بائیس برس پیشتر جبکہ گذشتہ جنگ یورپ کا خاتمہ ہوا اور اس کی تباہ کاریوں کا نقشہ ابھی دنیا کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ لیگ آف نیشنز (اقوام کی لیگ) کے نام سے ایک مجلس کا وجود عمل میں لایا گیا۔ جس کا مقصد محرکین نے دنیا کو دوبارہ جنگ کی مصیبتوں میں مبتلا ہونے سے نجات دلانا بتایا تھا۔ مگر اخبار بین اصحاب کو یہ بات بھولی نہ ہوگی کہ دنیا کے دور اندیش اور دانا لوگوں نے لیگ اقوام کی تحریک کے سرپرستوں کے عمل کو دیکھ کر اسی وقت ہی یہ پیشین گوئیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔ کہ دنیا کو جلدی ہی اس سے بھی زیادہ ہیبت ناک عالمگیر جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آج ان پیشین گوئیوں کا حرف بحرف صحیح ہونا دکھائی دے رہا ہے۔ لیگ اقوام کے لیڈروں نے طاقت و تشدد کے ذریعہ دنیا میں توازن قائم کرنے کا پالیسی اختیار کی۔ جس کا نتیجہ ہٹلر اور مسولینی جیسی ڈراؤنی اور بھیانک شخصیتوں کے روپ میں دنیا میں ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ نازی ازم اور فاسیزم کی پیدائش طاقت و تشدد کے آدرش روپی کھیت سے ہوئی ہے۔ یہ ہر دو تحریکیں خالص وحشیانہ طاقت کو ہی اپنے حصول مقصد کا واحد ذریعہ مانتی ہیں۔ ہٹلر اور مسولینی آج دنیا میں وحشیانہ قوت کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ ان کے سامنے تہذیب و اخلاق سب

نچلے درجے کی چیزیں ہیں۔ ہٹلر کا کہنا ہے۔ کہ جرمن کے معنے سپاہی کے ہیں۔ گویا اس کے خیال میں انسانیت کا بیش بہاء جوہر جسمانی طاقت یا ہتھیاروں سے جنگ کرنے کی قابلیت ہے ایک مسلم فخریہ بیان کرتا ہے۔ کہ اسلام نے تلواروں کے سایہ میں پرورش پائی ہے۔ ایک سکھ کرپان کو اپنی جان سے بھی عزیز جانتا ہے۔ ہندو تو رام اور کرشن آدی یودھا کھشتری راجاؤں کو اوتار مانتے ہیں اس کے معنے یہ ہیں۔ کہ دنیا کی تاریخ میں کوئی زمانہ ایسا نہیں ہوا۔ جس میں طاقت و تشدد کا استعمال نہ کیا گیا ہو۔ مذاہب کو عام طور پر ایک امن تحریک خیال کیا جاتا ہے دنیا میں بہت بڑے مذہبوں میں سے بدھ اور عیسائی مت۔ جن کے پیرؤں کی ملی جلی تعداد دنیا کی آبادی کے ۳/۴ کے برابر ہے۔ تو ایسے ہیں۔ جن کی بنیادیں عدم تشدد پر رکھی گئی ہیں مگر اس وقت ہم دیکھتے ہیں۔ کہ انہی دو مذاہب کے پیروکار سب سے زیادہ تشدد کے علمبردار بنے ہوئے ہیں۔ ہر زمانہ میں اور ہر مذہب میں تشدد کی طاقتوں کو استعمال میں لانے کی ضرورت محسوس کی جاتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ ویدانتی لوگ جو موجودات کو فقط ایشور ہی ظہور ہی خیال کرتے ہیں۔ ان کے سادھو اور تارک الدنیا آچاریوں کو بھی مختلف مٹھ بنا کر تشدد کو اپنے مخالفوں کے خلاف استعمال کرنا پڑا۔

ہر قوم و ملک میں لوگوں کے اپنے ہیرو (بہادر) پائے جاتے ہیں جن کی یادگار بڑی عزت سے منائی جاتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم

ہوگا۔ کہ یہ سب ہیرو تقریباً ایسے تھے۔ جنہوں نے متشددانہ فنون Violence کے استعمال میں کمال حاصل کیا ہوا تھا۔

ہندو ہر سال دسہرہ مناتے ہیں۔ کاغذ کے راون بنا کر اسے تیروں کا نشانہ بناتے اور لنکا کو آگ سے جلاتے ہیں۔ اور اس میں بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ گیتا اور مہا بھارت کی کتھا ہر زور ہزاروں جگہوں پر پوری دھارمک شردھا اور بھگتی سے ہوتی ہے۔ جس میں کورو اور پانڈو کی جنگ میں بھگوان کرشن کے کارناموں کو بڑے شاندار طریقہ سے دوہرایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ گیتا جیسے ادھیاتمک (روحانیت سے پُر) اپدیش کو بھی ایک جنگی کارنامے کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے اس کے حق میں ایک دلیل یہ دی جاتی ہے۔ کہ روحانیت کے اپدیش کا موزوں موقع وہ ہوتا ہے۔ جب موت بھی سامنے ہو۔ یعنی بستر مرگ پر۔ مرگھٹ پر یا میدان جنگ میں۔ چونکہ اس وقت موت آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ لہٰذا موت سے بچنے کا اپدیش بھی زیادہ موثر ثابت ہوتا ہے۔ مانا کہ عقلاً یہ بات وزندار ہو۔ مگر عام لوگ اتنی گہرائی میں کبھی نہیں جاتے۔ انہیں تو روزمرہ کے ظاہری ٹھاٹھ باٹھ سے واسطہ رہتا ہے۔ مسلمانوں میں جنگ خلافت اور عیسائیوں میں صلیبی جنگ بھاری اہمیت رکھتی ہیں۔ سکھوں کے جنگ اگرچہ حفاظتی جنگ ہیں۔ تاہم ان میں شہیدی کارنامے ایک بھاری مذہبی اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہزار ہا سالوں سے دنیا کے عوام الناس کا دماغ ہتھیار بند جنگ

کے ساتھ مانوس ہو چکا ہے۔ آج باقی دنیا میں اور ہندوستان میں اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہر جگہ عام لوگوں میں جنگ کو ایک پوتر بہادرانہ اور منصفانہ فعل تصور کیا جاتا ہے۔ ان جذبات کے زیر اثر پرورش پائے ہوئے انسانوں میں جنگ و جدل قتل وخون کا میدان ہمیشہ گرم چلا آیا ہے۔ تصور کی اس حالت نے عملی میدان میں بھی ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ جن سے جنگ و جدل دنیا میں لازمی امر ہو گیا ہے۔

مالی تقسیم

دنیا میں رائج الوقت مالی تقسیم کے طریقوں میں سب سے زیادہ مشہور اس وقت دو ہی طریقے ہیں۔ (۱) Capitalism سرمایہ پرستی یا سرمایہ داری (۲) communism جماعتی نظام بندی۔

سرمایہ داری: یورپ میں سرمایہ داری کی پیدائش براہ راست Fuedalism سے ہوئی ہے۔ فیوڈلزم کے معنے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے سرداروں کی حکومت۔ جیسی کہ اس وقت ہندوستان میں راجوں نوابوں، سرداروں۔ تعلقہ داروں و زمینداروں وغیرہ ناموں سے موجود ہے۔ یہ لوگ جو (Barons) بیرنز کہلاتے تھے مضبوط قلعوں یا فصیل بند جگہوں میں رہتے تھے۔ اور وقتاً فوقتاً اپنے گرد و

نواح کی جھونپڑیوں پر حملہ آور ہوا کرتے تھے۔ تاکہ اپنی دولت میں افزائش اضافہ کریں۔ اس طرح غلام بنائے ہوئے لوگ ان سرداروں کے باجگزار بنائے جاتے تھے۔ جن کے عوض میں یہ لوگ حملہ سے اُن کو محفوظ رکھنے کے ضامن ہوتے تھے۔ اس فیوڈل سسٹم کی تہ میں جو مقصد کام کر رہا تھا۔ وہ سوائے خودغرضی کے اور کچھ نہ تھا۔ لیکن جب مشینوں کے استعمال کا زمانہ آیا۔ تو یورپ میں ایک بڑا صنعتی انقلاب پیدا ہو گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب کہ ہندوستان سے بے انتہا خزانہ یورپ میں داخل ہو چکا تھا۔ اس زمانہ میں فیوڈل لارڈوں کی جگہ بڑے بڑے سرمایہ داروں نے لے لی۔ سرمایہ پرستوں نے بھی فیوڈلزم کی مانند ہی ایک ایسا سسٹم جاری کیا جس سے کہ وہ منافع سے اسی طرح مالا مال ہو جاتے تھے۔ جیسا کہ فیوڈل سردار باجگزاری کی آمدنی سے۔ مقصد ان لوگوں کا بھی ذاتی منافع ہی تھا۔ اور طریقہ یہ تھا کہ بڑی بڑی مشینوں کے استعمال سے جہاں تک بن پڑے۔ روپیہ جمع کیا جائے اور بلا لحاظ اخلاق و انسانیت اپنا اُلو سیدھا کیا جائے ایک واحد شخص مشنیری کی وجہ سے ہزاروں مزدوروں کی محنت کا پھل خود ڈکار جاتا ہے۔ وہ اپنی جیب بھر لیتا ہے۔ اور چونکہ وہ مشنیری کا مالک ہے۔ مزدور بیچارے بغیر کسی قسم کے شکوہ و شکایت کے مجبوراً مالک کی حرص و آز کا شکار بنتے ہیں۔ سرمایہ پرستی کے طریقہ میں سب سے بڑی برائی یہ ہے۔ کہ جہاں یہ منافع کمانے کے خیال کو

پوری آزادی دیتا ہے۔ اور لالچ اور خود غرضی بھی اس کے ساتھ ہی بڑھنے دیتا ہے۔ وہاں مزدور بیچارے کی آزادی کو بھی چھین لیتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے مال بنانے کے اوزاروں سے بالکل محروم کردیتا ہے۔ جب یہ ہوجاتا ہے تو سرمایہ دار کی فتح عرش تک پہنچ جاتی ہے اور مزدور کی غلامی گراوٹ کی سب سے نچلی تہ پر جاپہنچتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ سرمایہ دار اپنے نزدیکی آدمیوں کی لوٹ کھسوٹ پر قانع نہ رہ کر اپنی حرص کی آنکھ روئے زمین کے دور دور کے علاقوں پر ڈالتا ہے۔ کیونکہ اسے اپنے تباہ شدہ مال کے واسطے منڈی اور کارخانوں کے لئے کچے مال کی ضرورت ہوتی ہے۔ انجام کار وہ اپنے زر کے زور سے اس علاقہ کو اپنے قابو میں لے ہی آتا ہے۔ اور پوری احتیاط اس امر کی برتتا ہے۔ کہ اس علاقہ کے باشندے سوائے اس کے پانی بھرنے اور لکڑیاں کاٹنے کے اور کوئی کام نہ کرسکیں۔ وہ انہیں اپنا مال تیار کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اس کے مال کے لئے منڈی کہاں رہے گی۔ اس طرح سرمایہ پرستی۔ سلطنت پرستی لوٹ کھسوٹ اور کمزور لوگوں کو غلام بنانے کے جذبات کو پیدا کرنے والی بن جاتی ہے۔ اس طریقہ میں اخلاق وانسانیت کے جذبہ کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ کیونکہ آخر کار بیوپار بیوپار ہی ہے اس میں اخلاق و انسانیت کا کیا کام! بیوپار میں تو صرف ایک ہی چیز کی گنجائش ہے اور وہ ہے منافع۔ ایسا ہونے پر سرمایہ پرست کے اس

ناپاک کاروبار کے راستہ میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہیں رہ جاتی۔ اگر کسی قسم کی رکاوٹ پیدا کی جائے۔ تو جنگ وجدل خون وخرابہ کا میدان گرم ہوتا ہے۔ اور بے انتہا مصیبتوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے سرمایہ پرست کو اپنا الّو سیدھا کرنا چاہیئے۔ خواہ اس کے حصول کے لئے اسے خون کی ندیاں ہی بہانی پڑیں۔ بدقسمت مزدور جس نے زندگی میں اپنی آزادی کو تلانجلی دے کر سرمایہ پرستی کے چکر کا دھرا اپنا قبول کر لیا اس بیچارے کے سامنے قومی آن کی حفاظت اور جنگلی وغیر مہذب لوگوں کو تہذیب و اخلاق سکھانے کے اعلےٰ و اونچے مقاصد کے سبز باغ رکھے جاتے ہیں جس سے وہ بیچارہ دھوکے میں پھنس کر سرمایہ دار کی لالچ کی توپ کا نوالہ خوشی خوشی بن جاتا ہے۔ سرمایہ پرستی کی جو تصویر یہاں کھینچی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ وہ گھناونی ہے۔ لیکن جب سرمایہ پرستی کو اس کا بیرونی لباس اتار کر بالکل ننگا کر دیا جائے اور اسے اپنے اصل روپ میں عیاں کر دیا جائے۔ تو اس کے سوا اور وہ ہو بھی کیا سکتی ہے؟ سرمایہ پرستی بلاشک وشبہ دنیا میں خود غرضی لوٹ گھسوٹ، جنگ وجدل، خون وخرابہ اور تباہی وبربادی کا منبع ہے۔

(۲) Cammeusnism یعنی جماعتی نظام بندی:۔ روس میں کمیونزم کی تحریک سرمایہ داری کے مذکورہ بالا نقائص کو دور کرنے کے خیال سے کی گئی۔ اور قدرتاً اس سے یہ امید باندھی جاتی تھی۔ کہ

شاید یہ کوئی ایسا نمونہ پیش کر سکے۔ جسے ہم اپنی قوم کے لئے استعمال میں لا سکیں۔ کمیونزم نے دیکھا۔ کہ سرمایہ داری کی جڑ ہیں منافع کا مقصد یا خود غرضی یا فائدہ اٹھانے کا لالچ خواہ کسی نام سے اسے پکاریئے۔ یہ ایک ہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ لہذا اس نے اسے اکھیڑنے کے لئے پیداوار کو socialise کرنے یعنی جماعتی اصولوں کا پابند بنا دیا۔ اگر مال کو جو تیار کیا جاتا ہے۔ ساری جماعت کی ملکیت قرار دے دیا جائے۔ تو خود غرضی اور لالچ کی جڑ تو واقعی اکھڑ ہی جاتی ہے۔ اس طرح ذاتی منافع پسندی کی جڑ اکھیڑ کر کمیونزم نے خیال کیا۔ کہ وہ ان تمام خرابیوں کا قلع قمع بھی کر پائے گی۔ جو سرمایہ داری سے وابستہ ہیں۔ مگر ایسا کرتے ہوئے کمیونسٹوں نے بھی سرمایہ پرستی کے عین خلاف خود بھی ایک غلطی کھائی۔

سرمایہ داری میں ایک شخص کو مکمل اجازت ہے۔ کہ وہ آزادانہ طور پر کام کرے۔ اور جہاں تک اس کے لئے ممکن ہو ہر طور پر اپنے لئے منافع حاصل کرے۔ خواہ ایسا کرنے میں دوسروں کو نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ اس کو روکنے کے لئے کمیونزم دوسری انتہا تک جا پہنچا۔ اور اس نے شخصی آزادی کا بالکل گلا ہی گھونٹ دیا۔ اس نے جماعت کی بہتری تو مقدم رکھا۔ اور شخصیت کو اس قدر دبا دیا۔ کہ آخر کار شخصیت سرمایہ داری کے چکر کے دھرا کی مانند جماعت بندی کے چکر کا دھرا بن کر رہ گئی۔ چند آدمیوں کے ہاتھ میں ساری قوم کے

لئے کام تجویز کرنے اور اسے چلانے کا کام سونپ دیا گیا۔ اور باقی ساری قوم سوائے ان کے احکام کی تعمیل کے اور کچھ بھی نہیں کر سکتی کمیونسٹ اس پر یہ اعتراض کریں گے۔ یہ الزام ٹھیک نہیں۔ کیونکہ صرف چند آدمی ہی کام چلانے والے نہیں۔ بلکہ لکھوکہا ورکرز (کارکن) اپنی کونسلوں میں اپنی ضروریات کے مطابق اظہار رائے کر سکتے ہیں۔ مگر لکھوکہا کے فیصلوں کی حیثیت سوائے اس کے اور کیا ہے، کہ وہ چند ایک کے تجویز کردہ مسودوں کے حق میں یا خلاف رائے زنی کر سکیں۔ اتنا تو بالکل عیاں ہے۔ کہ خود تجویز کرنا۔ خود پیدا کرنا اور ذاتی قابلیت کے اظہار کے لئے کمیونزم بھی کوئی موقع مہیا نہیں کرتی۔ پھر ان چیزوں کے بغیر مال کے انبار جو ساری جماعت کے لئے کمیونزم مہیا کرنا چاہتی ہے۔ ایک شخص کے لئے کس مصرف کے ہیں؟ آخرکار انسان کیلئے سب سے زیادہ قیمتی چیز اس کی ذات ہے۔ یعنی اسے خود آزادی سے سوچ کر اور تجربہ کر کے اپنی قابلیت کے مطابق چیز تیار کرنے کا موقع ملنا چاہیئے۔ برخلاف اس کے اگر ایک شخص کو ایک مقررہ نمونہ کے مطابق ہی کام کرنا پڑے۔ تو وہ انسانیت کے سب سے قیمتی ورثہ یعنی شخصیت (ذاتی قابلیت) اسے محروم ہو جاتا ہے۔ اور ایک جماعتی نظام بندی پر اس سے زیادہ وزندار اعتراض اور نہیں ہو سکتا کیونکہ جماعت شخصوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اور وہ جماعت بندی جو شخصیت کو ہی تباہ کر دے اپنے مقصد کو ہی تباہ کر لیتی ہے۔

کمیونسٹوں کے لئے یہ ایک لا علاج مرض بن گیا ہے۔ انہوں نے سرمایہ داروں کے خلاف ذاتی منافع پرستی کے جذبہ کا الزام لگاتے ہوئے Centralised Production مرکز کے ہاتھ میں پیداوار کی باگ ڈور کے طریقہ کو سرمایہ پرستی کے نظام سے جوں کا توں ہی اٹھا کر اپنے نظام میں رکھ لیا Centralised Production (مرکزی پیداوار) کے تو معنے ہی یہ ہیں۔ کہ جو کچھ تیار کیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق سوچنے اور تجویز کرنے کا کام مرکز کی چند طاقتور ہستیوں کے ہاتھ میں سونپ دیا جاتا ہے۔ اور باقی ماندہ ساری جماعت صرف کام کرنے کی مزدور ہے۔ یعنی باقی سب لوگ محض چکر کے دھرے بن کر رہ جاتے ہیں ورکرز کو۔ یا یوں کہئے کہ عوام الناس کو سرمایہ داری اور کمیونزم کے نظاموں میں ایک ہی قسم کے مرض میں مبتلا رہنا پڑتا ہے۔ یعنی ان کا یہ حق نہیں کہ ایسا کیوں یا کس لئے؟ بلکہ ان کا فرض محض احکام کی تعمیل بلا چون وچرا کرتے ہوئے زندگی بتانا ہے۔ مرکز کے احکام کے ماتحت بڑے بڑے کارخانوں میں مسلمہ درجہ کی اشیاء بہت بڑے پیمانہ پر تیار کی جاتی ہیں۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے۔ کہ ایک شخص کو اپنی ساری عمر میں سوائے اس کے اور کام کرنا ہی نصیب نہیں ہوتا۔ کہ وہ ان ٹینوں پر جو باری باری جلدی سے اس کے سامنے رکھے اور اٹھائے جاتے ہیں۔ صرف لیبل چسپاں کرتا رہے۔ کام کی یہ یکسانیت انسان کی روح کو مردہ بنا دیتی ہے۔ وہ مشین جو انسان نے اپنے کام

کام کرنے کی سہولیت کے لئے ایجاد کی تھی۔ آخر کار اُسے اپنے
جیسی ایک مشین ہی میں تبدیل کر لیتی ہے۔ کیونکہ وہ مشین جس پر انسان
کام کرتا ہے۔ وہ بھی ایک ہی کام کر سکتی ہے۔ اور جب مرکز سے بٹن دبا
دیا جائے۔ تبھی کام کرنا شروع کرتی ہے۔ اور ایسا ہی اسے بھی کرنا
پڑتا ہے۔ خود سوچنا۔ خود تجویز کرنا۔ اور ذاتی قابلیت کے اظہار کی
طاقتیں آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی ہیں اور اگر موجود ہوں۔ تو ایسے نظام
میں وہ ایک رکاوٹ ثابت ہوتی ہیں۔ آپ غور کر کے دیکھیں۔ کیا ذاتی
قابلیت کا اظہار کرنا انسانیت کا ایک بہت بڑا جوہر نہیں ہے؟ ذرا
ایک بچے کی طرف دیکھو! وہ اس وقت سب سے زیادہ خوش ہوتا
ہے۔ جب اسے کھیلنے کی آزادی ہو۔ اس کے راستہ میں ذرا سی
رکاوٹ ڈالنے سے وہ تنگی محسوس کرتا ہے۔ اور بسا اوقات رونے
لگتا ہے۔ آپ اس کے کھلونوں سے کتنا ہی خوبصورت محل تیار کر کے
رکھ دیں۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ مگر اسی وقت ہاتھ پاؤں
مار کر اسے بکھیر دیتا ہے۔ اور خود اپنا محل بنانے کی کوشش کرتا ہے۔
اس کا اپنا تیار کیا ہوا محل خواہ کتنا ہی بھدا کیوں نہ ہو۔ اُسے دیکھ کر
خوشی سے پھولا نہیں سماتا۔ کیونکہ اس کی اپنی بنائی ہوئی چیز ہے۔
ہم نے کئی بار دیکھا ہے۔ کہ جب انسان کو کبھی اپنی روٹی آپ پکانے
کا اتفاق ہو۔ خواہ وہ کتنی جلی سڑی۔ ٹیڑھی پھیری کیوں نہ ہو جتنی لذیذ

اس کو وہ لگتی ہے۔ اتنی ایک کاریگر حلوائی کی تیار کردہ کبھی نہیں لگتی۔ آپ سیاست کا ہی معاملہ لے لیجئے۔ مختلف قومیں سیلف گورنمنٹ کے لئے کیوں جلاتی ہیں؟ غیر ملکی حکومتیں بعض حالتوں میں بڑی قابل و مقتدر ہوتی ہیں۔ لیکن انسان کی اندرونی خواہش اچھی قابلیت کی نہیں۔ بلکہ ذاتی قابلیت کے اظہار کی ہوتی ہے۔ اس لئے تو یہ مقولہ ہے

"اچھی حکومت اپنی حکومت جیسی نہیں ہو سکتی"

اگرچہ کمیونزم کے ماتحت مزدوروں اور کسانوں کی حالت بمقابلہ سرمایہ داری نظام کے بہت اچھی ہوتی ہے۔ کیونکہ کمیونزم میں پیداوار شخصی منافع کے لئے نہیں ہوتی۔ جیسا کہ سرمایہ داری میں ہوتی ہے پھر بھی جب تک کمیونزم میں مرکزی پیداوار کا طریقہ جاری ہے تب تک اس میں جہاں تک عوام الناس کا تعلق ہے۔ انفرادی غور کرنے اور ذاتی قابلیت کے اظہار کی آزادی کے لئے کوئی موقع نہیں رہتا۔ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے۔ ذاتی ترقی انسانیت کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ لہٰذا کمیونزم کے خلاف جو ایک جماعتی نظام ہے۔ یہ ایک بہت وزنی اعتراض ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مرکزی پیداوار کے اصولو پر کاربند ہونے کی وجہ سے اس نظام کو بھی سرمایہ داری نظام کی مانند اپنے مال کی کھپت کے لئے نئی منڈیوں اور اپنے کارخانوں کے لئے خام پیداوار کے لئے نئے نئے علاقوں کی طرف نظر دوڑانی پڑتی ہے۔

جس میں جنگ و جدل کا میدان بھی گرم کرنا پڑتا ہے۔ اصولاً جنگ سے نفرت کرتے ہوئے بھی غلط طریق کار کی وجہ سے انہیں اپنے اصول کی خلاف ورزی کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔

تشدد اور جھوٹ

دنیا بھر میں آج تشدد اور جھوٹ کا سکہ جما ہوا ہے۔ تشدد نے بہادری اور شہادت اور جھوٹ نے راج نیتی و تدبر کا جامہ اوڑھ رکھا ہے۔ خلقت خدا کا بلا دریغ سب سے زیادہ خون بہانے والا سب سے بڑا بہادر ہے۔ اور جھوٹ کے طومار باندھ کر سبز باغ دکھلا کر لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈالنے میں اور اس کی جیب کاٹنے میں سب سے زیادہ ماہر سب سے بڑا سیاست دان مدبر مانا جاتا ہے۔ اس وقت ہٹلر دنیا میں تشدد کا سب سے بڑا نمائندہ ہے اور ہندوستان میں لوگوں کا ایک طبقہ تو اُسے صرف بہادر ہی نہیں بلکہ اوتار ماننے کو بھی تیار ہے۔ جنرل ڈائر کو جلیانوالا کی خدمات کے عوض میں ولایت کے لوگوں نے ہندوستان سے واپسی پر بطور ایک سلطنت کو بچانے والے بہادر کے ایڈریس پیش کئے۔ اور تقریباً ایک لاکھ روپیہ نقد نذرانہ دیا۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے والا عام معنوں میں بہادر تسلیم کیا جاتا ہے۔ غرضیکہ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے مقولہ کا اس وقت لوگوں کے دل و دماغ پر سکہ جما ہوا ہے۔

لارڈ کرزن مرحوم کو ایک بڑا مدبر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ وہ کسی سیاسی مشن پر چین میں تشریف لے گئے۔ کہا جاتا ہے اس وقت ان کی عمر ۳۵ برس کی تھی۔ چین میں عام طور پر عمر رسیدہ آدمیوں کو زیادہ قابل احترام خیال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ لارڈ کرزن صاحب نے وہاں اپنی عمر ۵۰ سال کی بیان کی۔ تاکہ ان کا بیان چینیوں کی نظر میں زیادہ معتبر سمجھا جائے۔ یہ ہے تدبر جسے سیاست دان سراہتے ہیں۔ صریحاً جھوٹ کو بھی ایک خوبی خیال کیا جاتا ہے۔ آؤ ذرا غور کریں۔ کہ دنیا میں تشدد اور جھوٹ کی ضرورت ہے اگر ہے تو کہاں تک۔

عملی مشکلات

سبق ۶

ساری دنیا کو مشکلات کا سامنا ہے۔ مشکلات کی عملی شکل بیکاری، بیماری، مفلسی و غلامی و جنگ کی شکل میں نمودار ہو رہی ہے جنگ کی ذہنیت اس وقت ساری دنیا کے لئے ایک بھاری مصیبت ثابت ہو رہی ہے۔ کوئی ملک اپنی حفاظت کے لئے اور کوئی ملک دوسرے ملک کو زیر کرنے کے لئے جنگی تیاریوں میں مصروف نظر آتا ہے۔ اس ذہنیت کی وجہ سے ہر ایک ملک کو اپنے ذرائع کا بیش بہا حصہ جنگی تیاریوں کی نظر کرنا پڑتا ہے۔ لہذا بیکاری و مفلسی وغیرہ کے دیگر مسائل کھٹائی میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہر ملک میں مصائب کی شکل

اپنے اپنے نجی حالات کے مطابق مختلف ہے۔ لیکن مصائب سے خالی اس وقت کوئی بھی ملک دکھائی نہیں دیتا۔ ہمارے ملک ہندوستان میں اس وقت بیکاری، مفلسی، بیماری، غلامی اپنے پورے جوبن پر ہے۔ جنگ اپنی پوری ڈراؤنی شکل میں ساری دنیا پر پھیل جانے کے لئے اپنے بازو پھیلا رہا ہے۔ دنیا کا نصف سے زیادہ حصہ اور مہذب دنیا کا تقریباً سالم حصہ تو پہلے ہی اس کی لپیٹ میں آچکا ہے۔ دنیا کو اخلاق و تہذیب سکھلانے کے دعوے دار اس وقت اپنی پوری قوت کے ساتھ بچوں و عورتوں نہتے پُرامن شہریوں کو تہ تیغ کرنے اپنے ہمجنس نامور بہادر سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اوتارنے اور دنیا پر رہی سہی تہذیب و تمدن کی یادگاروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر سطح زمین کے ساتھ ہموار کرنے میں ایڑھی چوٹی تک کا زور لگاتے رہے ہیں جنگ کے مالی بوجھ کے نیچے دبی ہوئی دنیا۔ بیماری، بیکاری مفلسی اور غلامی جیسی جانکاہ مصیبتوں کا شکار ہو رہی ہے۔ دنیا کا دماغ بیکار ہو چکا ہے۔ ان مصائب کا حل سوچنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ مصیبتوں اور مشکلات کے پہاڑ ٹوٹے ہوئے ہیں۔ ان کے بوجھ کے تلے دبی ہوئی دنیا زبان حال سے مدد! مدد!! پکار رہی ہے۔ کیا سچ مچ ان مشکلات کا کوئی حل نہیں؟ کیا دنیا میں قیامت آنے والی ہے؟ یہ سوالات ہیں جو اس وقت ہر ایک کی زبان پر ہیں۔ یہ ہیں ہماری عملی مشکلات جن کا حل ہم نے پیش کرنا ہے۔

باب دوم

مشکلات کا حل

دنیا کی مشکلات جن کا نقشہ باب اول میں کھینچا گیا ہے۔ عموماً دو طرح کی وجوہات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اوّل ذہنی وجوہات۔ دوم عملی یعنی اقتصادی یا مالی وجوہات۔ اگرچہ ان ہر دو عمومی وجوہات کا عمومی حل بھی تجویز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن جب تک کسی ملک کی مشکلات خصوصی کا علم خاص حاصل نہ ہو۔ تب تک اس کا خاص حل تجویز کرنا ممکن نہیں۔ ہندوستان ہمارا ملک ہے۔ اور اس کی مشکلات کا بھی ہمیں براہ راست علم ہے۔ لہذا ان کا حل ہم سطور ذیل میں بیان کرتے ہیں۔
اس میں شک نہیں کہ اس وقت ہندوستان کی مشکلات دنیا کے دیگر ممالک کی نسبت مقابلتاً زیادہ پیچیدہ ہیں۔ اور ہندوستان کی پوزیشن

بھی کئی ایک نکتہ خیال سے مقابلۃً بہت گری ہوئی ہے۔ اگر اس ملک کے لئے کوئی مستقل اور یقینی حل پیش کیا جا سکے۔ تو غالباً وہی حل ہر ملک کے حالات خصوصی کے مطابق تھوڑی تبدیلیوں کے ساتھ سب کے لئے مستقل اور یقینی حل کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔

حل کے پیش کرنے وقت سب سے اول میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو رہا ہے۔ کہ ہندوستان میں عام دستور کے مطابق کسی نئے خیال کے پیش کنندہ کے خیالات کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی بجائے اُسکے ذاتی اعتقادات کو اس کے ساتھ جوڑ کر اس کی وقعت کو کم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میں یہ تو ضرور کوشش کرونگا کہ میرا حل کسی کے مذہبی احکامات کے خلاف نہ ہو۔ تاہم ایک نئی بات میں پرانی تفصیلات سے اختلافات لازمی ہوتا ہے۔ اس لئے میں اپنے ناظرین کو آگاہ کئے دیتا ہوں۔ کہ وہ اس قسم کی غلطی کے مرتکب نہ ہوتے ہوئے اپنی عقل کی کسوٹی پر میرے خیالات کو پرکھیں۔ آخرکار انسان کے پاس حق و باطل کی تمیز کے لئے آلہ کار اس کی عقل ہی ہے۔ اور یہ بات مذہب میں جوازیت کا درجہ رکھتی ہے۔ ہاں اگر کوئی یہ بھی مذہب سمجھ بیٹھے۔ کہ مذہبی معاملات میں عقل کو دخل ہی نہیں۔ تو پھر وہ انسان کو حیوان سے تمیز کرنے والے واحد جوہر سے محروم بنا دیتا ہے۔ ہاں اتنا تو قابل قبول ہے کہ اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے پھر بھی جو معاملہ سمجھ میں نہ آوے۔ اس کا حل اپنے مذہبی اعتقادات کے مطابق اپنے مذہبی رہبروں سے

ڈھونڈے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ مذہبی رہبر بھی جو حل پیش کرینگے وہ بھی کسی عقلمند انسان کی عقلمندی کا ہی نتیجہ ہے

ذہنی خون ۔۱

مذہبی توہمات کا حل

ذہنی حل نمبر (۱) ہماری قوم میں سب سے بڑا نقص جس نے ہندوستانیوں کو کاہل، سست، نکما اور اپاہج بنا رکھا ہے۔ وہ ہے ضروریات زندگی کے لئے خدا پر بھروسہ رکھنا۔ کوئی اُسے پراربدھ یا بھاگ کوئی تقدیر وقسمت کے نام سے پکارتا ہے۔ یہ خیال ایک جادو کی طرح تقریباً ہر ہندوستانی کے سر پر سوار ہے۔ اور وہ اس کے چنگل میں اس طرح گرفتار ہے۔ کہ ہندوستان جیسے "فردوس بروئے زمین" ملک کا مالک ہوتے ہوئے بھی مفلس و نادار عاجز و غلام بنا بیٹھا ہے۔ جب کبھی مشکل کا سامنا ہو۔ ایک تو دل کو یوں ڈھارس دے لیتا ہے۔

سکل پدارتھ ہیں جگ ماہیں
بھاگ ہین نر پاوت ناہیں

دوسرا یہ شعر گا کر دل بہلا لیتا ہے ؎

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانہ کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

حافظ شیرازیؒ کا شعر ورد زبان ہے ؎

؎ در کوئے نیکنامی مارا گذر نہ دادند
گر تو نمے پسندی تغیر کن قضا را

(اس کے یہ معنے ہیں۔ کہ اے انسان نیک نامی کے کوچہ سے گذرنے کی تم کو اجازت نہیں ہے۔ اگر تو اسے ناپسند کرتا ہے۔ تو اپنی قسمت کو تبدیل کراؤ) مشکلات اور ناکامی کے موقع پر ہر انسان کے اندر سے جو جوش و خیال اس کے حل کے لیئے پیدا ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا فقروں کا اثر جو روزمرہ کی زندگی میں انسان کی زندگی پر پڑتا رہتا ہے۔ وہ قلب انسانی کو اس قدر بے حس بنا دیتا ہے۔ کہ ایک مٹی کے قلبوت کی مانند انسان بے حس و حرکت سا ہو جاتا ہے۔ اور اپنے اندر کی آواز کو سن نہیں سکتا۔ سوائے مسجد و مندر میں ناک رگڑنے اور اپنے معبود کے آگے گڑگڑانے اس کی منتیں ماننے و سجدہ کرنے اور قسمت کو کوسنے کے دوسرا راہ نہیں پاتا۔ آؤ ذرا غور کریں۔ اس خیال کی تہ میں سچائی کہاں تک ہے۔

جب ہم یہ خیال کرتے ہیں۔ کہ ہمیں رزق اپنی قسمت کے مطابق ملتا ہے۔ تو دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنے ہیں۔ کہ پرماتما یا خدا یا God وقتاً فوقتاً انسانوں کے لیئے ان کی ضروریات دھن دولت مہیا کرتا رہتا ہے۔ کیا ایسا سمجھنا ایک مخول نہیں ہے؟ ذیل میں چند ایک دلائل آپ کے غور کے لیئے پیش کی جاتی ہیں:۔

دلیل ۱:۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ کہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے والی اشیاء سب کی سب دھرتی یعنی زمین اور انسان کی محنت و مزدوری سے پیدا ہوتی ہیں۔ کیا کوئی بھی انسانی ضرورت کی شے آپ ایسی اپنے تصور میں بھی لا سکتے ہیں۔ جو زمین یا انسانی محنت کے علاوہ کسی دیگر ذریعہ سے پیدا ہو سکتی ہو۔ یقیناً نہیں! پھر آپ یہ دیکھیں۔ کہ زمین ابتدائے آفرینش سے وہی چلی آتی ہے۔ اس کے چپہ چپہ پر انسان کا قبضہ ہے۔ اس کی پیداوار کی تقسیم ہر ملک کے انسانی وضع کردہ قوانین کے ماتحت ہوتی ہے۔ پھر وہ کون سی چیز یا جگہ ہے جو خدا کے قبضہ میں ہو۔ جس کی تقسیم وہ وقتاً فوقتاً کرتا ہے۔

دلیل ۲:۔ اگر یہ خیال کیا جائے کہ لوگوں میں پیدائشاً امیر و غریب سب کی موجودگی اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ یہ قانون الٰہی کے ماتحت عمل میں آتی ہے۔ اور انسان کے کرم کردار کے پھل یا بدلہ کے طور پر ملتی ہے۔ تو یہ قیاس بھی ٹھیک نہیں۔ کیونکہ روس نے اپنے ملک میں مالی مساوات کا سلسلہ جاری کر کے امیری و غریبی کی تمیز عملاً اڑا دی ہے۔ اگر یہ کوئی قدرتی قانون ہوتا۔ تو انسانی قانون اسے بدل نہ سکتا جیسا کہ قدرت نے زمین، آفتاب، مہتاب، ستارے، سیارے جیسی حالت میں پیدا کئے ویسے ہی چلے آتے ہیں۔ پانی، ہوا، آگ وغیرہ قدرت کی پیدا کردہ ہیں چاہے کتنا ہی بڑا سائنسدان کوشش کیوں نہ کرے۔ وہ پانی کی تاثیر ٹھنڈی سے گرم۔ ہوا کی خشکی و ہلکا پن اور آگ کی گرمی کو اپنی

عقل وعلم کے زور سے تبدیل نہیں کر سکتا ہے۔ خدائی قانون اٹل ہونے سے ناقابل تبدیل ہے۔ جو تبدیل ہوتا ہے۔ وہ قانون قدرتی نہیں چونکہ ایک ملک نے عملی طور پر امیری وغریبی کی تمیز اڑا کر رکھ دی ہے۔ لہذا یہ قدرتی قانون نہیں ہو سکتا۔

دلیل ۳ ہم اس پر ایک اور طریقہ سے بھی غور کر سکتے ہیں۔ اگر سچ مچ پرماتما یا خدا ہی انسانوں کا روزی رساں ہے۔ تو مغرب کے وہ ممالک جو خدا پرستی سے روز بروز دور بھاگ رہے ہیں۔ جہاں کے لوگوں کو دعا و پرارتھنا کے لئے وقت نہیں اور جو خدا کی ہستی تک سے منکر ہو رہے ہیں دھن ودولت سے مالا مال کیوں ہیں؟ اور ہندوستان جہاں کے لوگ ترکال سندھیا۔ پانچ وقتی نماز کے عادی ہیں۔ جہاں غریب سے غریب انسان بھی خدا کے نام پر حسب توفیق دان دیتا رہتا ہے۔ اور جہاں کے لوگوں کی کمائی کا بہت بڑا حصہ مندروں مسجدوں اور گوردواروں کنوؤں تالاب۔ باولیوں دھرم شالاؤں خیراتی سراؤں کی تعمیر میں خرچ ہوتا ہے۔ وہ دنیا بھر کے ممالک سے مفلس ونادار کیوں ہیں؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کہ بھگوان آستکوں کو بھول کر ناستکوں پر مہربان ہو۔ اگر ایسا ہو تو مذہب کی بنیاد ہی انسان کے دل سے اکھڑ جائے۔ ایسے خدا کی پرستش کے کیا معنے جو اپنے پرستاروں کی بجائے غیر پرستاروں کو سامان عیش وآرام بانٹے؟

دلیل ۴ دنیا کے مختلف ممالک کی سیاسی تاریخ پر نظر دوڑانے سے ہمیں واضح ہوتا ہے کہ جس جس ملک نے مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا۔ اُس اُس ملک کا قدم سیاسیات کی ترقی کے میدان میں آگے بڑھتا گیا۔ یورپین قوموں میں جب تک مذہب سیاست پر سوار ہو رہا۔ تب تک وہ ممالک مذہبی جنگوں میں اس بُری طرح پھنسے رہے۔ کہ انہیں سیاسی اور مالی ترقی کے لئے کوئی موقع ہی نہ مل سکا۔ دور کیوں جائیں۔ جاپان و ترکی کی حالت پر ہی غور کیجئے۔ جاپان نے اپنی حکومت کو جب سے مذہب سے لاتعلق کیا۔ اس وقت سے وہ ملک دن دوگنی اور رات چوگنی ترقی کرنے لگا۔ ترکی نے خلافت کا جوا گلے سے اتار کر اپنی حکومت کو بالکل سیاسی رنگ میں ڈھال لیا۔ اس وقت سے ترکی ایک ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں آن کھڑا ہوا۔ یہ سب باتیں اس امر کی وضاحت کرتی ہیں۔ کہ خدا کو انسانی کاروبار۔ دھن دولت کے معاملات میں کوئی دخل نہیں۔ مذہب یا خدا کا حلقۂ اثر فرد واحد تک محدود ہے۔ جو ہر شخص کی ذاتی ملکیت ہے۔ اور جس میں ہر شخص آزاد ہے۔

دلیل ۵ آج جرمنی اپنی ہوائی طاقت کے زور سے نصف درجن سے زائد ممالک کو اپنے ماتحت کر چکا ہے۔ روس نے فن لینڈ کو بزور شمشیر جھنجھوڑ ڈالا۔ آج مفتوحہ ممالک کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ ان ممالک کے باشندے بیچارے خانماں برباد۔ بے سروسامان مارے مارے پھر

رہے ہیں۔ لاکھوں اور کروڑوں انسان نان شبینہ کے بھی محتاج ہیں۔ حالانکہ جرمنی اور روس نے اپنی مطلب براری کے لئے کبھی ایشور سے مدد نہیں مانگی۔ لیکن ہم نے دیکھا کہ پولینڈ۔ فن لینڈ۔ ناروے۔ ہالینڈ بلجیم وفرانس سب کے سب اپنی حفاظت کے لئے خدا سے دعائیں اور پرارتھنائیں کرتے رہے۔ اگر سچ مچ لاج پاٹ۔ دھن دولت کی تقسیم خدا کے اپنے ہاتھ میں ہوتی تو یقیناً وہ اپنے اپاسکوں کا مددگار بنتا۔ ان پر زبردستی کرنے کی توفیق ناستکوں کو نہ ہو سکتی تھی۔

دلائل تو اور بھی کئی دی جا سکتی ہیں۔ مگر میرا خیال ہے۔ مذکورہ بالا پانچ دلائل اس امر کی تردید کے لئے کہ خدا روزی رساں ہے۔ غور کرنے والے انسانوں کے لئے بالکل کافی ہیں۔ پھر سوال پیدا ہوگا۔ کہ کیا خدا کا دنیا کے دھن دولت کے ساتھ بالکل کوئی تعلق نہیں ہے؟ جواب میں عرض کروں گا۔ کہ خدا کا ان سے بہت بڑا تعلق ہے۔ بلکہ زمین اور انسان جو دولت کو پیدا کرنے کے اصلی ذرائع ہیں۔ ان کا خالق یعنی پیدا کرنے والا خدا ہی ہے۔ اس نے تو انسانی ضروریات کو رفع کرنے کے لئے زمین ہوا۔ پانی۔ روشنی آسمان (آکاش) و دیگر ہر قسم کی بیش بہا نعمتیں بہت کافی وشافی مقدار میں ابتدائے آفرینش سے بلاقیمت ومعاوضہ ہر ایک کے لئے یکساں طور پر مہیا کر رکھی ہیں۔ میرا مدعا تو فقط یہ ہے۔ کہ اس کی تقسیم میں اس کا دخل نہیں۔ بندہ یا انسان خود ہی اس سے فائدہ اٹھانے والا و اس کی تقسیم کرنے والا ہے۔ ایک

انسان جس کو خدا نے صحیح و سالم جسم عطا کیا ہو۔ اگر خدا سے ہاتھ پاؤں وغیرہ کسی اعضا بدنی کے لئے دعا مانگے۔ تو یہ حرکت کیسی مضحکہ خیز معلوم ہو گی۔ بعین ہی اس طرح جب خدا نے ابتدائے آفرینش سے دنیا کو دھن و دولت سے و ضروریات زندگی سے مالا مال کر رکھا ہے۔ پھر اس کے لئے اس سے دعائیں مانگنا تضیع اوقات و فضول حرکت کے سوا کچھ نہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ کیا دعا مانگنا بالکل فضول حرکت ہے نہیں ہرگز نہیں۔ میں تو روزانہ پرارتھنا کے حق میں ہوں۔ مگر مانگنا ان چیزوں کے لئے چاہیئے۔ جو انسان کے پاس نہیں۔ خدائی اوصاف مثلاً ہمیشہ خوش رہنا۔ سب کی بھلائی چاہنا وغیرہ ایسی چیزیں ہیں۔ جنہیں انسان کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے خدا سے توفیق مانگنا بھی واجب معلوم ہوتا ہے۔ مگر یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ انسان کے اندر اس قسم کی توفیق بھی اس کی اپنی قوت عمل سے ہی پیدا ہو سکتی ہے۔ گویا بہر حال انسان کے اندر قوت عمل موجود ہونی لازمی ہے۔ پھر سوال ہو گا۔ اگر ضروریات کے لئے بھی دعا مانگی جائے۔ تو اس میں ہرج کیا ہے؟ اس میں بہت بڑا نقص تو یہ ہے۔ کہ انسان رب کے بھروسہ پر کاہل و سست بن جاتا ہے۔ اور قوت عمل اس میں پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے اندر یہ خیال جاگزیں ہوتا ہے۔ کہ خدا خود بخود اس کے لئے سب کچھ مہیا کرے گا۔ حالانکہ جو کچھ وہ مانگتا ہے۔ وہ پہلے ہی مہیا کیا گیا ہے۔ اور اس کے حصول کی طاقت اور ذرائع ہر انسان کو یکساں

طور پر قدرت کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں۔ انسان فعل خود مختار ہے۔ اس نے اپنے بھلے اور بُرے کرموں کی جزا اور سزا بھگتنی ہے بھول یا غلطی انسانی خاصہ ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ آج دنیا میں بے انصافی جبر و تشدد، غریبی و امیری جیسی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ورنہ اگر ان سب معاملات میں خدا کا دخل ہوتا تو یہ نقائص اس میں موجود نہ ہوتے۔

اگر ایک دفعہ ہمارے دلوں میں یہ خیال جاگزین ہو جائے۔ کہ اپنی بگڑی کو بنانے والے اور سنوری کو بگاڑنے والے ہم خود ہی ہیں۔ تو پھر فوراً ہندوستان میں وہ قوت عمل عود کر آئے گی۔ جس کے ذریعہ وہ اپنی مشکلات کا حل کر سکیں گے۔

مضمون نمبر ۲۶

تشدد (جنگ) اور جھوٹ کا علاج

یہ قانون قدرت ہے کہ جَو بونے سے جَو اُگتا ہے اور گندم بونے سے گندم۔ یہی اصول انسانوں کے باہمی سلوک میں کام کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اگر آپ کسی سے محبت کریں گے تو دوسری طرف سے آپ کے لئے پریم کا دریا ٹھاٹھیں مارنے لگے گا۔ نفرت سے نفرت پیدا ہوتی ہے تشدد سے بدلہ لینے کا جذبہ بڑھتا ہے۔ اگر آپ زبردستی کسی کو کوئی کام کرنے پر مجبور کریں گے۔ تو وہ پہلا موقع ملتے ہی اس زبردستی کا بدلہ چکائے گا آپ نے دیکھا یا سنا ہوگا۔ کہ پٹھانوں میں خصوصاً یاغستان کے قبائلوں میں قتل اور خون بہانا ایک معمولی شغل خیال کیا جاتا ہے۔ ان

لوگوں میں خون کا بدلہ خون سے لینے کا دستور ہے۔ اگر کوئی شخص خود بدلہ لینے میں ناکام رہے۔ تو اس کا بیٹا اور پوتا اپنے باپ اور دادا کا بدلہ لیتے ہیں۔ اس طرح یہ سلسلہ لا تنا ہی بن جاتا ہے۔ اور وہاں قتل وخون کی اس قدر ارزانی ہو گئی ہے کہ وہاں یہ جرم کی بجائے ایک فرض اور معمولی شغل خیال کیا جاتا ہے۔

دنیا میں جبر و تشدد یعنی تلوار کے زور سے ایک قوم کا دوسری قوم کو زیر کرنے کا دستور بہت پورانا چلا آتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں جنگ وجدل کا میدان آئے دن گرم رہتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں (Versailles) ورسائی کے عہد نامہ کے ذریعہ انگریز و فرانسیسی اتحادیوں نے جرمنی کو نیچا دکھایا۔ اور اس کی فوجی طاقت کو کم کر کے اس پر تاوان عائد کر کے اور اس کے اچھے علاقوں کو اس سے الگ تھلگ کر کے اسے مفلوج بنا دیا۔ اور دل میں سمجھا۔ کہ اب جرمنی عمر بھر سر نہ اُٹھا سکے گا۔ لیکن دنیا نے دیکھا کہ جرمنی میں ہٹلر ازم یا نازی ازم کا دور دورہ جنگ کے سولہ سترہ سال میں ہی اس زور سے پیدا ہوا۔ کہ اس نے ورسائی کے عہد نامہ کی دھجیاں اُڑا کر رکھ دیں۔ اس قدر منتشددانہ جنگ کے ہتھیار و ساز و سامان و فوجی طاقت اس نے پیدا کر لی۔ کہ چند ماہ میں چکوسلاوکیہ، پولینڈ، ناروے، ڈنمارک، ہالینڈ بلجیم اور فرانس جیسے زبردست ممالک کو اپنی فوجی قوت کے زور سے تاخت و تاراج کر کے رکھ دیا۔ کہنے کو تو اس نے ان اقوام کو زیر

کر لیا۔ لیکن یہ سب لوگ بھی اپنے اپنے موقع کی تاک میں رہیں گے۔ وقت آنے پر وہ موجودہ ہٹلر سے بھی زبردست ہٹلر اپنے اپنے ملک میں پیدا کر دیں گے۔ جو جرمن کو تو وہ خاک میں تبدیل کر کے رکھ دیں گے۔ یہ ایک سلسلہ لا انتہائی ہے۔ جنگ سے جنگ پیدا ہو گا۔ جنگ سے امن کبھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ کیا یہ مرض لا علاج ہے۔ اور انسان کی بہتری کے لئے پیدا کی گئی یہ دنیا زندہ دوزخ کا نمونہ بن کر رہ جائے گی؟ موجودہ یورپین جنگ کے آغاز سے تقریباً دو برس پہلے لارڈ لوتھیاں صاحب جو اس وقت ریاست متحدہ امریکہ میں برطانوی سفیر کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ہندوستان میں تشریف لائے۔ اور وارد ھا میں مہاتما گاندھی جی سے ایک سے زیادہ ملاقاتیں کیں۔ ان ملاقاتوں کا نچوڑ جو اخبارات میں لارڈ موصوف نے شائع کرا دیا۔ میں اُسے اپنے الفاظ میں پیش کرتا ہوں۔ وہ اس سوال کے حل پر کافی روشنی ڈالتا ہے

لارڈ لوتھیاں:۔ مہاتما جی! ہم لوگ یورپ میں اس وقت جنگ و جدل سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں۔ سب ملک اپنے اپنے طور پر جنگی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ہر ملک کے سیاست دانوں کو سوائے جنگی تیاریوں کے دوسرا کوئی کام کرنے کا وقت نہیں ملتا۔ ملکوں کے تمام تر ذرائع جنگ کے سامان بنانے اور اکٹھا کرنے پر خرچ کئے جاتے ہیں۔ گذشتہ جنگ عظیم کی بربادیاں اور تباہ کاریاں ابھی تک ہماری

آنکھوں کے سامنے ننگی ناچ رہی ہیں۔ دل سے کوئی نہیں چاہتا۔ کہ وہ پھر ان جانکاہ مناظر کو یورپ میں دوبارہ پیدا کرے۔ لیکن باوجود اس خواہش کے ایک سخت ہیبت ناک جنگ کے بادل یورپ کے آسمان پر گھٹائیں باندھے کھڑے ہیں۔ ہمیں تو باوجود غور و فکر کے اس مصیبت سے بچنے کا کوئی راہ دکھائی نہیں دیتا۔ آپ کے عدم تشدد و عدم تعاون کا چرچا ہم بہت سن رہے ہیں۔ آج میں یہ جاننے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ کہ کیا واقعی آپ کے اصول جنگ و جدل سے ہمارا چھٹکارا کرا سکتے ہیں؟

مہاتما گاندھی جی:۔ آپ کے خطرات و شبہات بالکل صحیح ہیں۔ تشدد سے تشدد پیدا ہوتا ہے۔ جنگ کی تیاریوں سے آپ امن کا کرہ ہوائی پیدا نہیں کر سکتے۔ باہمی بے اعتمادی کی وجہ سے خطرہ و شبہات دن بدن بڑھتے ہی جائیں گے۔ ان کا یقینی علاج اہنسا و ستیہ ہے۔ ان دو الفاظ کے اندر دنیا کی شانتی و امن کا راز بند ہے۔

لارڈ لوتھیاں:۔ وہ کیسے؟ یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔

مہاتما جی:۔ ان اصولوں یعنے اہنسا (عدم تشدد) اور ستیہ (راستی) کی تشریح کرنے سے پیشتر میں ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ ایک بنیادی بات ہے۔ جس پر یقین رکھنے کے بغیر ان اصولوں پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہے۔ میں انسان کو صرف ہاڈ مانس

کا پنجر ہی تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ اس کے اندر جو آتما (روح) کی جوت جگ رہی ہے۔ اسے۔ ہیں پریم سے بھری ہوئی۔ سکھ دکھ کو محسوس کرنے والی۔ اپنے سنگاروں (تاثرات) کے مطابق انسانی جسم سے کام لینے والی امر (لافانی) شکتی خیال کرتا ہوں۔ یہ جوہر سب انسانوں کے اندر یکساں طور پر کام کرتا ہے۔ اتنا کہا ہی تھا۔ کہ لارڈ لوتھیاں بیچ میں بات کاٹ کر بولے۔

لارڈ لوتھیاں:۔ مہاتما جی! آپ کی قطع کلام تو ہوتی ہے۔ مگر میں یہ صاف کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ روح کے فلسفہ کے متعلق تو میں نے پہلے بھی بہت کچھ پڑھ سن رکھا ہے۔ آپ مجھے ان اصولوں کو موٹے طور پر عملی پہلو سے سمجھائیے۔ فرض کرو۔ کہ جب سائنر مسولینی نے ابیسینیا پر حملہ کیا۔ وہاں حبشہ کی بجائے آپ ہوتے۔ تو آپ ان کا مقابلہ اپنے ہتھیاروں سے کیسے کرتے۔؟

مہاتما جی:۔ لیجئے میں اس طریق پر ہی جواب دینے کو تیار ہوں۔ آپ کے سوال کا جواب شروع کرنے سے پہلے آپ کے لئے یہ جاننا ضروری ہے۔ کہ ہمارا ہتھیار جس سے ہم حملہ آور کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ Non-violent Non-cooperation (غیر جارحانہ عدم تعاون) ہے۔ اور اس ہتھیار کو چلانے والا سپاہی ستیاگرہی کہلاتا ہے۔ ستیاگرہی بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ اول طاقتور ستیاگرہی جو non-violence of the strong

Non-violence کا ماہر ہوتا ہے۔ دوسرا کمزور ستیاگرہی of the weak پر کاربند ہوتا ہے پہلی جماعت کا ستیاگرہی اہنسا اور سچائی کو اپنا جزو ایمان سمجھتا ہے۔ اور سخت سے سخت تقریر اشتعال سے بھی مشتعل نہیں ہوتا۔ حتےٰ کہ گولی کے سامنے بھی نہایت خندہ پیشانی سے اپنا سینہ سامنے کر دیتا ہے۔ بدلہ لینے کا تو اس کے دل میں خیال تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے دشمن کے ساتھ بھی بیر نہیں رکھتا۔ بلکہ اوس کی بھلائی کے لیئے بھی اسی طرح خواہاں و کوشاں رہتا ہے۔ جیسے اپنے کسی دوست کے لئے۔ دوسری جماعت کا ستیا گرہی ان اصولوں کو اپنا جزو ایمان نہ سمجھ کر بطور پالیسی اُسے اختیار کر لیتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے۔ کہ موجودہ حالت میں ہمارے لئے یہی ہتھیار بہتر ہے۔ وقت آنے پر (تشدد) violence بھی اس کے لیئے جائز ہتھیار ہو سکتا ہے۔ بیرونی حملہ آور سے بچاؤ کے لیئے پہلی جماعت کے ستیاگرہیوں کی ضرورت ہے۔ خواہ وہ قلیل ہی کیوں نہ ہوں دوسری جماعت کے ستیاگرہیوں اور اس کے حمایتوں کی تو کثرت لازمی ہے۔ جب یہ دونوں جزو حسب ضرورت پورے ہوں۔ تو پھر کامیابی یقینی ہو جاتی ہے۔ اب میں آپ کے سوال کے جواب کی طرف آتا ہوں۔

یہ تو آپ بھی مانتے ہیں۔ کہ ہمیشہ جنگ سے پہلے نامہ و پیام کا سلسلہ ہر فریقین میں ہونا لازمی ہے۔ جس میں حملہ آور اپنے مطالبات پیش

کرتا ہے۔ جس کے پورا نہ ہونے کی صورت میں وہ حملہ کی دھمکی دیتا ہے۔ اگر سائنر مسولینی ہمارے ملک پر حملہ آور ہونے سے پیشتر کوئی مطالبات ہمارے سامنے رکھتا۔ تو دو تین ہی قسم کے ہو سکتے:
مثلاً۔ (۱) وہ ہمارے ملک کے کسی خالی قطعہ زمین پر قابض ہونا چاہتا ہے۔ (۲) وہ ہمارے ملک میں خاص تجارتی یا صنعتی حقوق حاصل کرنا چاہتا۔ (۳) ہمارے ملک کی سیاسی باگ ڈور قطعاً اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا ہے۔

پہلے مطالبہ کی صورت میں اگر ہم دیکھتے کہ ہمارے قومی مفاد کا اس میں کوئی نقصان نہیں۔ تو ہم اس کا وہ مطالبہ قبول کر لیتے ورنہ نہیں۔ دوسرے مطالبہ کی صورت میں ہم انہیں کہتے۔ کہ ہمارے قومی مفاد کے حلقہ کے اندر اندر ہمارے قوانین کے ماتحت ہم یہ مطالبہ بھی منظور کرتے ہیں۔ تیسرے مطالبہ کی صورت میں بھی ہم ان سے کہتے۔ کہ اگر آپ کو حبشہ کا بادشاہ کہلانے کا شوق ہے۔ تو بڑی خوشی سے ہمارے ملک کے بادشاہ بن جائیے ہم مزاحمت نہ کریں گے اور اگر آپ ہمارے مالی اور سوشل نظام کو بگاڑ کر اپنے اصولوں کے ماتحت ہمیں زندگیاں ڈھالنے پر مجبور کرنا چاہتے ہیں۔ تو ہم یہ مطالبہ ماننے سے انکار کر دیں گے۔
بالفاظ دیگر:۔ اس طرح ہم ہر طرح کی کوشش کرتے۔ کہ مسولینی کو کسی طرح کا اشتعال دیئے بغیر اس کے تمام جائز مطالبات کو مانیں اور ناجائز مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیں۔ اگر پھر بھی وہ حملہ آور ہوتا

ضروری خیال کرنا۔ تو ہم اسے اطلاع دے دیتے۔ کہ ہم آپ کا ہتھیار بند مقابلہ بالکل نہیں کریں گے۔ اور اسے کہہ دیتے۔ کہ اس ملک کی تمام گورنمنٹ مشینری پر تم بلا روک ٹوک قابض ہو سکتے ہو۔ اس طرح ہم کوشش کرتے۔ کہ اسے ایک بھی گولی چلانے کا موقع نہ دیا جائے۔ ہم اسے یہ بھی صاف بتا دیتے۔ کہ تمہارے تمام ناجائز مطالبات کو ہم بالکل نہ مانیں گے۔ اور اس کے جواب میں بھی ہم ہتھیار بند مقابلہ نہیں کریں گے بلکہ تمہارے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کریں گے۔ اگر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی۔ تو ممکن ہے۔ مسولینی جیسا سنگ دل انسان کئی آدمیوں کو اپنی سختی کا شکار بناتا۔ قید و بند کے علاوہ پھانسی اور گولی کا نشانہ بنانے سے بھی نہ چوکتا۔ مگر ہماری دونوں جماعتوں کے ستیاگرہی ایسی حالت میں اپنی برداشت کا پورا پورا ثبوت دیتے۔ وہ اپنی سختیوں کی آزمائش سے آخر کار تنگ آ جاتا۔ مسولینی خواہ کتنا ہی سنگ دل کیوں نہ ہو۔ آخر کار انسان ہے۔ اس کے جسم کے اندر بھی ایک جیتی جاگتی روح دوڑ رہی ہے۔ سنگ دل مسولینی کی پیدائش ان تاثرات سے ہوئی ہے۔ کہ دنیا میں جبر سے انسان اپنی خواہشات کی تکمیل دوسروں سے کرا سکتا ہے۔ جب اسے معلوم ہوتا۔ کہ معصوم اور بے گناہ انسانوں کا بے دریغ خون بہا کر بھی وہ کسی قوم سے اپنے احکام کی تکمیل نہیں کرا سکتا۔ تو وہ اندرونی طور پر اس جبر کے ہتھیار کی ناپائیداری کو تسلیم کر لیتا۔ اور دوسرے کامیابی کے طریقوں پر کاربند ہونے کی

فکر کرنا۔ اگر کوئی قوم اچھی طرح منظم ہو اور شانت مئی ہتھیاروں کو چلانے کی قابلیت رکھتی ہو۔ اور ان کی کامیابی میں پورا یقین بھی رکھتی ہو۔ تو اسے دنیا کی جبر کی کوئی طاقت بھی شکست نہیں دے سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ شانت مئی جنگ میں شکست تو کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ جب مسولینی کے دل میں تبدیلی آجاتی تو عدم تشدد کی فتح مکمل ہو جاتی۔ عدم تشدد دل کی تبدیلی سے ہی فتح حاصل کرتا ہے۔ آپ خود ہی سوچیں کہ مسولینی ایسے حالات میں اگر اپنے جبر کی آزمائش بھی کرتا۔ تو ہمارے نقصانات کبھی اس کا عشر عشیر بھی نہ ہو سکتے تھے۔ جتنے کہ تشدد کے ذریعہ مقابلہ کرنے سے ہوئے۔

لارڈ لوتھیان۔ بے شک۔ مہاتما جی آپ کی سکیم ذہنی طور پر تو بالکل مکمل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کیا آپ یورپ کی موجودہ حالات کے مطابق مصیبت سے نجات دلانے کے لئے بھی کوئی خاص نسخہ تجویز فرما سکتے ہیں؟

مہاتما جی:۔ اس وقت میرے دماغ میں تو سوائے ہندوستان کے اور کسی کے لئے جگہ نہیں۔ میں یورپ کے موجودہ مسائل سے ناواقف ہوں۔ لہذا ان کا علاج بھی کیسے بتلا سکتا ہوں؟ اگر ہندوستان میں میں ان اصولوں کو کامیابی سے کارآمد ثابت کر سکا۔ تو پھر باقی دنیا خود بخود اس کی آزمائش کی خواہش مند بن جائے گی۔ اور ہندوستان اس معاملہ میں سب کی رہنمائی کر سکے گا۔

مذکورہ بالا گفتگو میں نہایت خوبصورتی سے غیر جارحانہ عدم تعاون سے جبر و تشدد کے مقابلہ کے طریقہ کو واضح کیا گیا ہے۔ اگر ہندوستان کے دل میں یہ بات ذہن نشین ہو جائے۔ کہ بہادر تلوار کا دھنی نہیں بلکہ اس کے وار کو خاموشی سے برداشت کرنے والا ہے۔ تو ہندوستان میں ایک شانتمئی انقلاب پیدا ہو جائے۔ ایک آدمی کے گالی دینے پر دوسرا اس کے منہ پر تھپڑ رسید کرتا ہے۔ پہلا اسے اینٹ یا پتھر یا لاٹھی دے مارتا ہے۔ دوسرا چاقو۔ چھری یا تلوار چلانے لگتا ہے۔ جس سے دونوں زخمی ہو جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دونو ہی موت کے گھاٹ اتر جائیں۔ یا اگر ایک موت کے گھاٹ اُترا۔ تو دوسرا پھانسی کے تختہ پر لٹکے گا۔ یا عمر بھر جیل کی کال کوٹھڑی میں سڑتا رہے گا۔ اگر نوبت کسی کی موت تک نہ بھی پہنچتی۔ تو زخمی ہو کر ہر دو مرہم پٹی کے لئے کچھ دن بستر پر تو ضرور دراز ہوں گے ہی اور اگر اس وقت لوگوں نے ان کو چھڑا دیا۔ تو بھی دل میں ایک دوسرے کے خلاف بدلہ لینے کا جذبہ اسی طرح بنا رہے گا۔ جو موقع پا کر پھر ایک دوسرے پر وار کریں گے دوسری طرف اگر ایک نے گالی گلوچ کیا۔ یا سخت الفاظ استعمال کئے تو ستیا گرہی اسے بالکل شانتی اور خاموشی سے برداشت کرے گا اسے کسی قسم کا جواب نہ دے کر اس سے پھر بھی خندہ پیشانی سے پیش آتا رہے گا۔ لازمی ہے کہ ایک دن اس آدمی کی آتما (ضمیر) خود ہی اسے شرمندہ کرے گی۔ وہ نہ صرف گالی گلوچ بند کر دے گا۔ بلکہ ستیا گرہی

کی برائی کا قائل ہو کر گذشتہ زیادتیوں کے لئے معافی کا خواستگار ہوگا اور آئندہ کے لئے دونوں کے تعلقات دوستانہ بن جائیں گے۔ اس قسم کا تجربہ مصنف نے خود کئی بار اپنی زندگی میں کیا ہے۔ اور ہر آدمی اس کا تجربہ اپنے طور پر آسانی سے کر سکتا ہے۔ اب غور کیجئے۔ ان دونوں طریقوں میں کس قدر فرق ہے۔ تشدد آمیز وطیرہ کا نتیجہ۔ نقصان۔ عداوت اور آئندہ زندگی کو تلخ بنانا ہے عدم تشدد آمیز وطیرہ کا نتیجہ۔ بغیر نقصان کے دلوں میں محبت بڑھانے والا اور آئندہ زندگی کو ایک دوسرے کے لئے مددگار و سازگار بنانے والا ہے۔ کیا بہادر وہ ہے۔ جو کسی بات کو برداشت نہ کر کے جواب میں تشدد آمیز وطیرہ اختیار کر لیتا ہے۔ دوسرے کو دشمن بنا لیتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے ہر دو ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتے ہیں۔ یا وہ ہے جو سخت الفاظ کو خندہ پیشانی سے سہہ لیتا ہے۔ دوسرے کے دل کو جیت لیتا ہے اور آئندہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے محبت و آشتی کا میلان پیدا کر لیتا ہے۔ تشدد والے کی کمزوری تو پہلے قدم پر ہی عیاں ہے کیونکہ وہ اپنے دل پر قابو نہیں رکھتا۔ اور جھٹ بھڑک اٹھتا ہے برخلاف اس کے ستیاگرہی کی یہ بہادری ہے کہ وہ اپنے من پر قابو رکھتا ہے۔ اور سخت ترین اشتعال دلانے پر بھی نہیں بھڑکتا ہندوستانی لوگوں کا فرض ہے۔ کہ وہ بہادری کے اس راز کو سمجھیں

ہندوستان اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ روحانیت کا دلدادہ ہے۔ اور وہ ہی اس راز کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پھر خوش قسمتی یہ ہے کہ مہاتما گاندھی جیسی سچی اور بےغرض دنیا کی برگزیدہ ہستی بطور راہنما ہندوستان کو نصیب ہے۔

لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سچائی تو سادہ لوحی اور بدھوپن کی مظہر ہے۔ اگر سب لوگ سچائی کے پابند ہو جائیں دنیا کا کاروبار ہی سب بند ہو جائے۔ دنیا کے بیوپار میں تو جھوٹ اور بھید سے ہی کمائی ہے۔ اگر بھید اڑ جائے تو بیوپار بھی بند ہو جائے۔ آج اگر دنیا کی حکومتیں ڈپلومیسی کو ہاتھ سے چھوڑ بیٹھیں تو ایک دن بھی اُن کا کام نہ چلے۔ سچائی تو صرف اسی حد تک ہی مفید ہے کہ انسان کا مقصد نیک ہونا چاہیئے۔ اس بات کی پرواہ نہیں کہ وہ مقصد کیسے ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے لوگ اسی اصول کے زیادہ دلدادہ ہیں لیکن حقیقت میں یہ بھی ایک دھوکا ہے۔ سچائی سے بڑھکر دنیا میں کوئی آسان، مؤثر اور بے گزند ذریعہ حصولِ مقصد کا نہیں ہے۔ راج نیتی یا ڈپلومیسی کو جھوٹ کا نہیں بلکہ سچ کا ہی پابند ہونا چاہیئے تبھی یہ مفید ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔ آج اگر ایک آدمی سچائی کے اصولوں پر کاربند ہو کر دوکان چلائے تو چند دنوں ہی میں اُسکی دوکان چل نکلتی ہے۔ وجہ یہ کہ چھوٹا بڑا جو کوئی گاہک آتا ہے وہ ایک ہی دام سب سے لیتا ہے اور اچھی چیز دیتا ہے۔ اس سے اُس کا اعتبار مارکیٹ میں بڑھ جاتا ہے اور جب تک وہ سچائی پر چلتا رہتا ہے اُس کا کاروبار بھی ترقی کرتا رہتا ہے۔ سچائی سے اعتماد بڑھتا ہے اور جھوٹ سے بے اعتمادی پیدا

ہوتی ہے۔ آج جھوٹ کا رواج ہونے سے ہندوستان میں بے اعتمادی کا دَور دَورہ ہے۔ آج بڑے سے بڑے اُستاد۔ گورو۔ پیر۔ مہاتما کسی پر اعتماد نہیں رہا۔ حتیٰ کہ انسان کو اپنے آپ پر بھی اعتماد نہیں رہا۔ حالت یہ ہے کہ خود غرضی کی وجہ سے بھائی بھائی کا۔ باپ بیٹے کا دشمن بن رہا ہے۔ ایسا کوئی بیوپار ہندوستان میں چل نہیں سکتا جسکی بنیاد باہمی اعتماد پر رکھی گئی ہو۔ دنیا کے لوگ عام طور پر بیوپار مشترکہ سرمایہ کی کمپنیوں کی شکل میں چلاتے ہیں۔ لیکن ہندوستان میں کمپنیاں قائم کرنے والے چور خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ جھوٹ کی ہستی کے ہی کرشمے ہیں۔ دنیا کے ممالک میں آج کل بے اعتمادی اس قدر بڑھ گئی ہے۔ کہ ہر ایک ملک دوسرے سے اپنی حفاظت کے لئے تیاریوں میں مصروف ہے۔ اگر ایک لمبی مار کی توپیں بناتا ہے۔ تو دوسرا بڑے بڑے ٹینک بنا لیتا ہے۔ ہوائی جہازوں کی ساخت میں اس قدر مقابلہ ہو رہا ہے۔ کہ ہر ملک اس کے بنانے کے لئے اپنے سارے ذرائع ختم کر چکا ہے۔ بلکہ قرضہ لے کر بھی اس پر خرچ کر رہا ہے۔ اس باہمی بے اعتمادی کا کہاں ٹھکانہ ہے۔ جنگ و جدل و کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ پھر بھی یہ بے اعتمادی روز بروز بڑھ رہی ہے۔ یہ سب مشکلات جھوٹی راج نیتی کی پیدا کردہ ہیں۔ لہٰذا سمجھدار انسانوں کا فرض ہے۔ کہ وہ جھوٹ و سچ کی تمیز کر کے سچ ہی کو اپنا مسلک قرار دیں۔ اس میں ہی انسان ہندوستان اور تمام دنیا کی بہتری کا راز مضمر ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں ہندوستانی مشکلات کا ذہنی حل بتلایا گیا ہے۔ اگر ہمارے خیالات میں مذکورہ حلوں کی روشنی کے مطابق تبدیلی پیدا ہو جائے۔ تو ہندوستانیوں میں وہ قوت عمل پیدا ہو سکتی ہے۔ جس سے نہ صرف وہ اپنے ملک کو آزاد کرا سکتے ہیں۔ بلکہ تمام دنیا کو مستقل امن اور آشتی کی راہ دکھلا سکتے ہیں۔ اور ہندوستان کے لئے پھر وہی پرانا درجہ "استادِ زماں" کا حاصل کر سکتے ہیں

ہندوستانی مشکلات کا عملی حل

ہندوستان کی موجودہ مشکلات کی عملی صورت بیکاری، مفلسی اور سیاسی غلامی ہے۔ ایسا اوپر واضح کر دیا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے۔ کہ ان کی وجوہات اقتصادی ہیں۔ بیکاری بیماری و مفلسی تو اقتصادی وجوہات سے پیدا ہوتی ہیں۔ سیاسی غلامی کی وجہ بھی اقتصادی ہی ہے۔ یہ بھی واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ دنیا میں اس وقت جو دو بڑے بڑے اقتصادی نظام کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یعنے (۱) Capitalism سرمایہ پرستی (۲) Socialism جماعتی نظام بندی۔ یہ دونوں کوئی حقیقی حل پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ تو پھر ہندوستان کو ایسے حالات میں اپنی مالی مشکلات کا کوئی اپنا حل تجویز کرنا ہوگا۔ جس سے ہم اپنا پائیدار و خوشحال قومی نظام تعمیر کر سکیں۔

سرمایہ پرستی کے نظام میں ہم نے یہ سقم پایا۔ کہ اس کے اندر منافع کمانے کے جذبہ کو بلا روک ٹوک بڑھنے کی آزادی ملتی ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر خودغرضی، لالچ، تشدد اور لوٹ کھسوٹ کے جذبات خوب زور سے بڑھتے ہیں۔ جماعتی نظام بندی نے اس کا علاج ایسا کیا۔ جس سے منافع کمانے کا جذبہ تو واقعی ختم کر دیا گیا۔ مگر اس سے انسانوں کے اندرونی اوصاف کی ترقی کا موقع بھی ساتھ ہی سلب کر دیا۔ اور انسان کو ایک مشین کے پرزہ میں تبدیل کر دیا۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ہمارا حل کیسا ہے؟ اگر ہم منافع کے جذبہ کو قائم رکھیں تو بھی۔ اور نہ قائم رکھیں تو بھی غلطی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایک معمہ ہے جس میں ہم پھنس جاتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ عام منطقی لوگ جانتے ہیں۔ یہ تمام معمہ جات دکھاوٹی ہوتے ہیں۔ حقیقت میں ہر ایک کا حل ممکن ہوتا ہے۔ موجودہ حالت میں ہمارا حل ان دونوں انتہاؤں کے درمیان معلوم دیتا ہے۔ کیونکہ ہمارا حل یہ ہے کہ نہ ہی منافع کا جذبہ بذات خود بری چیز ہے۔ اور نہ ہی جماعتی نظام بذات خود بری چیز ہے۔ اور خوش قسمتی سے۔ جان بوجھ کر یا انجانے ہمارے بزرگوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہوا تھا۔ منافع کا جذبہ اس وقت برا بن جاتا ہے۔ جب کہ وہ اپنی قدرتی حدود سے تجاوز کر کے دوسروں کی حق تلفی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح

جماعتی نظام بذات خود برا نہیں ہے۔ لیکن یہ اس وقت برا بن جاتا ہے۔ جب یہ اپنے قدرتی حدود سے تجاوز کر کے افراد کو خود تجویز کرنے کے مادہ سے محروم کر دیتا ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو ہمارا حل ایسا ہونا لازمی ہے۔ جس میں منافع کے جذبہ اور جماعتی نظام دونوں کے لئے جگہ ہو۔ اور ہمارا یقین ہے۔ کہ مال کی پیداوار کو غیر مرکزی پیداوار Decentralised production نے اور سودیشی کے منتہائے مقصود پر عمل کرنے سے یہ دونوں مقاصد حل ہو جاتے ہیں۔ پیداوار کو غیر مرکزی بنانے کا مطلب یہ ہے۔ کہ مرکز سے اس قسم کے حکم دینے سے انکار کرنا۔ کہ کون سی چیزیں مہیا کرنی ہیں۔ اور کس طرح تیار کرنی ہیں۔ بلکہ اس بات کو ہمیشہ بنانے والے شخص کی اپنی دانست و خود تجویز کرنے کی قوت پر چھوڑ دینا چاہیئے۔ صرف اس طریقہ سے ہی اندرونی اوصاف کے اظہار اور ذاتی ترقی کے لئے موقع مہیا کیا جا سکتا ہے۔ اس پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ اگر ہم ہر ایک شخص کو اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کی کھلی اجازت دے دیں تو اس کا نتیجہ دوبارہ سرمایہ داری کی حالت میں ظاہر ہو جائے گا۔ کیونکہ اس میں آدمی ذاتی لالچ سے ساری پیداوار کا اجارہ دار بننے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کو روکنا چاہیئے اور یہ آسانی سے رک جاتا ہے۔ جب کہ مال کی تیاری بہت بڑے پیمانہ پر بڑی بڑی مشینوں

سے عمل میں نہ لائی جائے۔ اور جو بھی مشین استعمال کی جاوے۔ وہ بہت چھوٹے پیمانہ کی ہونی چاہیئے۔ جس پر ایک آدمی ہاتھ سے کام کر سکے۔ مثلاً کپڑے سینے کی مشین۔

اصل سودیشی کی ماہیت

علاوہ ازیں ہمیں لوگوں کو سودیشی مال کا اصل مقصد بھی سمجھانا پڑے گا۔ اور انہیں بتانا پڑے گا۔ کہ یہ ان کا فرض اولین ہے۔ کہ وہ اپنے ہمسایہ کے بنے ہوئے مال کو ترجیح دیں۔ بمقابلہ اس مال کے جو دور فاصلہ کی جگہوں سے لایا گیا ہو۔ اس کے معنے یہ ہوئے کہ ہمیں اس پورانے آدرش کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہر ایک گاؤں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔ کم از کم ہر ایک گاؤں اس میں بسنے والوں کی اہم ضروریات زندگی کو خود ہی پورا کر سکنے کے قابل ہونا چاہیئے۔ اگر ہر ایک گاؤں اس طرح اپنا سہارا آپ بن سکے۔ اور اپنے بسنے والوں کی اہم ضروریات کو خود پورا کرنے لگے۔ تو اس گاؤں میں ہر ایک رکن کا مدعا یہ بن جائے گا۔ کہ سب سے پہلے وہ اپنے ہمسایہ کی ضروریات کو پورا کرے۔ اور پھر اس کا کام اپنے گاؤں کی خاص خاص ضروریات کو پورا کرنے تک ہی محدود ہو جاتا ہے وہ صرف اتنا ہی مال تیار کرے گا۔ جتنی کہ اس کے گاؤں میں کھپت ہوگی۔ تو پھر زیادتی پیداوار کا سوال ہی اڑ جائے گا۔ اور اس کے

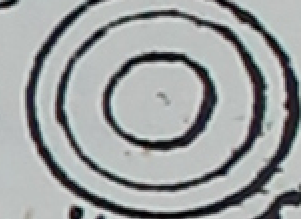
ساتھ ہی زیادتی پیداوار کی کھپت کیلئے مارکیٹ ڈھونڈنے کا سوال بھی نہ رہے گا۔ کوئی شخص پیداوار کی اجارہ داری کی کوشش ہی نہ کرے گا۔ کیونکہ مذکورہ بالا سودیشی آدرش کی موجودگی میں ہر ایک گاؤں کی پیداوار کی ضرورت اپنے گاؤں سے باہر نہ رہے گی۔

اس موقع پر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ لفظ "سودیشی" کی تشریح کر دی جائے۔ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے۔ کہ اس کے عملی معنے تو ایک تنگ دلانہ اور عدم برداشت والی دھڑہ بندی کے ہیں۔ جو صرف اپنے چھوٹے سے گروہ کی ہی بھلائی چاہتی ہے۔ خواہ وہ گروہ غلطی پر ہو یا درستی پر۔ اُسے دوسروں کی بہتری سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسی تنگدلانہ دھڑہ بندی کی حمایت کو کبھی بھی آدرش نہیں کہا جا سکتا اور اگر اس پر عمل کیا جائے۔ تو بہ لازماً قومی اور بین الاقوامی اتحاد کو تربتر کرنے والی ثابت ہوگی۔ ایسے زمانہ میں جب کہ ریڈیو۔ ہوائی جہاز اور تار برقی نے دور دراز ممالک کے لوگوں کو ایک دوسرے کے نزدیک لا بٹھایا ہے۔ اور اس طرح دنیا کے درمیانی فاصلہ کی وسعت کو چھوٹا کر دیا ہے۔ یہ ایک سخت غلطی ہے۔ کہ دنیا کو ایسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بانٹ دیا جائے۔ جو آپس کے تاثرات سے بالکل محروم ہو جائیں۔ مگر "سودیشی کی تلقین کرنے والوں کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے ان کے مقصد کی بنیاد تو یہ کہاوت ہے کہ

"اول خویش بعدہ درویش"

ہمارا سب سے پہلا فرض اپنے نزدیک ترین ہمسایہ کی طرف ہے اور پھر اس سے آگے اور آگے وسعت پذیر ہو کر ساری انسانیت کو ایک ہی گھیرہ میں حلقہ بند کر لیتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک خاندان کو لیں۔ ایک آدمی اپنے کنبہ کے ممبروں سے سب سے زیادہ نزدیک ہے بمقابلہ دوسرے لوگوں کے۔ لہذا ان کی خوراک و پوشاک و پرورش کا بوجھ اس کے کندھوں پر سب سے زیادہ پڑتا ہے بمقابلہ کسی دیگر کے۔ وہ اپنے خاندان کے متعلق اپنا فرض پورا کرتا ہوا سوسائٹی اور انسانیت کے متعلق بھی اپنے فرائض کو پورا کر لیتا ہے۔ یہ حلقہ جات یا دائرہ جات الگ تھلگ نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی مرکز کے گرد کھچے ہوئے ہیں۔

بکھرے ہوئے  اس شکل کے نہیں۔ بلکہ

 ایسے ہم مرکز ہیں۔ گویا کہ چھوٹے اور بڑے دائرہ میں باہمی مخالفت لازمی نہیں۔ بلکہ چھوٹے کی خدمت کرنے سے بڑے کی بھی خدمت ہو جاتی ہے۔ پس انہی معنوں میں سودیشی کا مطلب اپنے سب سے نزدیکی ہمسایہ کے متعلق اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے سے ہے۔ غرضیکہ ان کی طرف ہمارا فرض سب سے اول ہے اور سب سے بڑا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں۔ کہ ہم ہمہ تن اسی گروہ کے لئے وقف ہو جائیں۔ اور دوسروں کے متعلق اپنے فرائض کو نہ پہچانیں۔ اس بارے میں "اول خویش بعدہ درویش" کے مقولہ سے ہمارا

مطلب بالکل واضح ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ صرف یہ کہتا ہے کہ سخاوت کا آغاز گھر سے ہوتا ہے۔ نہ کہ گھر پر انجام ہو جاتا ہے۔ یعنی ہی حقیقی سودیشی کا مطلب اپنے گاؤں سے آغاز کرتا ہے۔ نہ کہ وہیں ختم ہو جاتا۔ بلکہ گاؤں سے باہر کے دائرہ کو بڑھاتے بڑھاتے ساری دنیا کے متعلق اپنے فرائض کی سرانجام دہی بن جاتا ہے۔ یہ ایک بڑا اہم معاملہ ہے۔ مگر اس کے متعلق غلط فہمی پھیلنے کا بھی سب سے زیادہ احتمال ہے۔ لہذا یہ نہایت موزون معلوم دیتا ہے۔ کہ ہم سودیشی کے سب سے بڑے حامی کی اپنی زبان سے اس کے خیالات اسس موضوع پر نقل کر دیں۔ آنجہانی شری یت سی۔ ایف اینڈریوز نے

Mahatma Gandhi's Ideas

(مہاتما گاندھی کے خیالات) نام سے جو کتاب لکھی ہے اس کے صفحہ ۱۲۶، ۲۷ سے نقل کیا گیا ہے۔

گاندھی جی فرماتے ہیں:۔

صرف "سودیشی" ہی ایک ایسا اصول ہے۔ جو انسانیت اور پریم کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہے۔ یہ خیال کرنا سخت غلطی ہے۔ کہ میں سارے ہندوستان کی خدمت کے لئے باہر نکلوں جبکہ میں بمشکل اپنے خاندان کی خدمت کرنے کے قابل ہوں۔ یہ بہتر ہوگا کہ میری کوششیں اپنے خاندان پر ہی مرکوز رہیں۔ اور میں یہ سمجھوں۔ کہ اس کے ذریعہ میں

ساری قوم کی یا یوں کہو کہ ساری انسانیت کی خدمت بجا لا رہا ہوں ۔ یہی انسانیت ہے اور یہی پریم ہے ۔ نیت ہی ہمیشہ کام کی نوعیت کا فیصلہ کرتی ہے ۔ مثال کے طور پر میں غلط طریقہ پر اپنے خاندان کی خدمت کرنے لگوں ۔ بلا یہ دیکھے کہ ایسا کرنے سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے ۔ فرض کرو میں ایسی ملازمت قبول کروں ۔ جس میں دوسروں سے رشوت ستانی کرتا ہوں ۔ میں ایسا کرنے سے اپنے آپ کو دولتمند تو بنا لوں گا ۔ اور اپنے خاندان کی ناجائز خواہشات بھی پورا کردوں گا ۔ مگر ایسی حالت میں حقیقتاً میں نہ ہی اپنے خاندان کی خدمت بجا لاتا ہوں اور نہ ہی ملک کی ۔ اگر میں یہ خیال کروں کہ پرماتما نے مجھے ہاتھ اور پاؤں اس لئے عطا کئے ہیں کہ میں ان سے اپنا اور اپنے لواحقین کا گذارہ کر سکوں ۔ تو پھر میں فوراً اپنی زندگی اور ان کی زندگی جو مجھ پر منحصر ہیں بالکل سادہ بنا دوں گا ۔ اس طریقہ پر گامزن ہو کر میں اپنے خاندان کی خدمت بغیر کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے بجا لاؤں گا فرض کرو کہ ہم میں ہر ایک اس طریقہ کو اختیار کر لے ۔ تو ہم آسانی سے ایک آدرش حکومت بھی پیدا کر لیں گے سب کے سب ایک ہی وقت میں ایک جیسی حالت میں نہیں ہو سکتے ۔ لیکن ہم میں سے جو اس پر عمل پیرا ہوں گے ۔ صاف

طور پر اس نیک دن کو لانے میں کافی امداد کن ثابت ہونگے
زندگی کو اس طریقہ پر ڈھالتے ہوئے اگر ظاہراً ایسا معلوم ہو
کہ میں ہندوستان کی خدمت کر رہا ہوں۔ اور دوسرے
کسی ملک کی نہیں۔ تاہم ایسا کرتے ہوئے میں کسی دوسرے
ملک کو نقصان پہنچانے کا موجب نہیں ہوتا۔ میری حب
الوطنی دو طرفہ ہے۔ یعنی مطلقانہ اور مشترکانہ بھی۔ مطلقانہ
یہ اس لحاظ سے ہے۔ کہ میری خدمت کسی کے ساتھ مقابلہ
نہیں کرتی۔ "اپنی جائداد کو ایسے طریقہ پر استعمال کرو جس سے
کسی دوسرے کو نقصان پہنچنے کا احتمال نہ ہو" یہ ایک اچھا
قانونی مقولہ ہی نہیں۔ بلکہ زندگی کا ایک شاندار اصول ہے
یہی اہنسا یا پریم کے اصول پر عمل کرنے کی صحیح کنجی ہے
یہ ہمارا ہی فرض ہے جو ایک عظیم دھرم Faith کے
رکھشک ہیں۔ کہ ہم اپنے عمل سے ثابت کریں۔ کہ نفرت سے
پیدا شدہ حب الوطنی "تباہ کن ہوتی ہے"۔ اور پریم اور محبت
سے پیدا شدہ حب الوطنی "زندگی بخش ہوتی ہے"

حقیقی سودیشی کوئی مطلقانہ چیز نہیں ہے یہ قبول کرتے ہوئے
کہ تمام دنیا ایک ہے۔ اور اس کے اجزا نہایت مضبوطی سے جڑے
ہوئے ہیں۔ یہ صرف اتنا بتلاتی ہے۔ کہ انسان کو دنیا کی خدمت اس چھوٹے
حلقہ کی خدمت کے ذریعہ کرنی چاہیئے۔ جس میں کہ وہ خود بستا ہے۔ اور

دوسروں کے اس حق کو بھی کھلے بندوں تسلیم کرے۔ کہ وہ بھی اپنے اپنے حلقہ جات کی خدمت کرنے کا ویسا ہی حق رکھتے ہیں۔

مذکورہ سودیشی کے آدرش کے زیر عمل یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ چند مقتدر شخصیتیں پیداوار کی اجارہ دار بنکر باقی دنیا کو اپنی مطلب براری کے لیئے لوٹ سکیں۔ اور انہیں غلام بنائے رکھیں۔ کیونکہ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ کہ پیداوار صرف اتنی ہوگی۔ جتنی کہ لوکل ضرورت ہوگی۔ اس طرح لالچ اور خود غرضی کے جذبات کو بڑھنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ جیسا کہ سرمایہ داری کے نظام میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں پیداوار بالکل مساوی طور پر حسب ضرورت تقسیم ہو جاتی رہے گی۔ اگر پیداوار گاؤں کے لوگوں میں مساوی طور پر حسب ضرورت تقسیم ہوگی۔ تو لازماً منافع بھی اسی طریقہ پر تقسیم ہو جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ دولت چند آدمیوں کے ہاتھ میں جمع نہ رہ سکے گی۔ آمدنی میں بہت بڑا فرق بالکل رک جائے گا اور یہ بھی نتیجہ ہوگا۔ کہ مفلسی اور بھوک معدوم ہو جائے گی۔ اور سب کو روزی مہیا ہو جائے گی۔ البتہ ایک گاؤں کا دوسرے گاؤں سے آپس میں مال کا تبادلہ تو ضرور ہوگا۔ کیونکہ کوئی گاؤں بھی دنیا کی تمام چیزیں تو اپنے گاؤں میں پیدا نہیں کر سکتا۔ اور پھر ہر ایک ضلع میں آب و ہوا۔ زمین اور کچی پیداوار کے لحاظ سے اپنی اپنی خصوصیات تو بنی ہی رہتی ہیں تجارت یک طرفہ نہیں۔ بلکہ باہمی ضرورت کے مطابق ہوگی۔ کسی گاؤں کو اس قدر پیداوار مال کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جس

سے دوسرے گاؤں میں بیکاری پھیل سکے سوال ہوگا۔ کہ یہ کس طرح سے ہوگا، جواب یہ ہے۔ کہ جب عوام الناس کی رائے سودیشی کے متعلق پختہ ہوجائے گی۔ تو یہ معاملہ بالکل آسان ہوجائے گا۔ کیونکہ لوگ، خود بخود ہی ایسے مال کو جو ان کے ہاں تیار ہوتا ہے ترجیح دینگے اور اس کو جو باہر سے تیار ہو کر آتا ہے۔ استعمال نہ کریں گے۔ اور جب تک رائے عامہ پختہ نہیں ہوتی۔ تب تک دیہاتی پنچایتوں کو چاہیئے۔ کہ وہ بذریعہ قانون سازی یا حفاظتی محصول عائد کرکے بیرونی مال کو غیر ضروری طور پر درآمد ہونے سے روکیں۔ اس سے گاؤں کے مالی توازن کو بھی قائم رکھا جاسکیگا اور منافع پسندی کے جذبہ کو بھی غیر محدود طور پر پھیلنے سے روکا جاسکے گا۔ مزید براں پیداوار کے غیر مرکزی طریقہ پر عمل پیرا ہونے سے ہر ایک گاؤں صرف اتنا ہی مال بنائے گا۔ جتنا اس کی ضروریات کے لئے کافی ہوتا ہے۔ تو مارکیٹ میں مقابلہ کی بھی ضرورت نہ رہے گی۔ اور جب مارکیٹوں میں مقابلہ نہ رہے گا۔ تو پھر جنگ اور دھڑہ بندیوں کے مظالم کے لئے بھی موقع نہ رہے گا۔ اس طرح امن اور مستقل خوشحالی ملک کے لئے اور تمام دنیا کے لئے حاصل ہوسکتی ہے۔ مزید براں چونکہ غیر مرکزی پیداوار کے طریقہ کے زیر اثر کاریگر کو اجازت ہوتی ہے۔ کہ اپنی مرضی کے مطابق جو اور جیسا چاہیئے مال تیار کرے۔ تو شخصی کوشش و ترقی کے لئے کافی میدان پیدا ہوجائے گا۔ کسی جماعتی نظام سے اس سے

بڑھ کر اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے؟

ان راستوں پر چل کر ہماری قومی زندگی کی دوبارہ تعمیر کی کوشش ہونی چاہیئے۔ اس سے موجودہ سرمایہ پرستی اور جماعتی نظاموں سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا انسداد بھی ہو جاتا ہے۔ اور ہماری قومی وراثت کی ٹھیک پیروی بھی ہو جاتی ہے۔ پہلے یہ بتلایا جا چکا ہے۔ کہ کس طرح ہمارے پرانے بزرگ دیہاتی نظام کو چلاتے تھے۔ وہ منافع کے جذبہ کو ضرورت سے زیادہ نہ بڑھنے دیتے تھے۔ ہر ایک کو کام ایسے طریقہ پر مہیا کرتے تھے۔ کہ کارکنوں کی آمدنی میں بہت زیادہ فرق نہیں رہتا تھا۔ گاؤں اپنی ضروریات کو خود ہی پورا کیا کرتے تھے۔ شخصیت اور انسانیت کو وہ باقی سب پر ترجیح دیا کرتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ تمام مقاصد بہت اچھے طریقہ پر حاصل ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم صنعت کو غیر مرکزی طور پر چلائیں اور سودیشی کا برت دھارن کریں۔ جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا ہے۔

غلامی کیسے دور ہو سکتی ہے؟

آپ نے یہ تو دیکھا کہ مذکورہ بالا سطور میں جس عملی حل کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے کیسے بیماری، مفلسی اور بیکاری دور ہو جاتی ہے۔ غلامی کیسے دور ہوتی ہے؟ یہ بھی جان لیجئے۔ آج کل کوئی بھی ملک دوسرے کو زیر کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ جب تک کہ ایسا

کرنے میں اسے مالی فائدہ نہ ہو۔ مفت کی سر دردی کوئی مول لینا نہیں چاہتا۔ گذشتہ جنگ یورپ میں برطانیہ نے میسو پوٹامیہ میں قبضہ جما کر بعد میں اُسے چھوڑ دیا۔ وجہ یہ کہ اس کی حکومت اور انتظام پر جو خرچ اٹھتا تھا۔ وہ اس سرزمین کے محاصل سے پورا نہ ہو سکتا تھا۔ آج صنعتی زمانہ میں ایک ملک کو دوسرے پر قابض ہونے کے لئے ذیل کی دو وجوہات میں سے ایک یا دونو کے سبب ضرورت لاحق ہوتی ہے۔

(۱) اپنی بہت بڑھی چڑھی صنعتی پیداوار یا بیوپار کے لئے منڈی ڈھونڈنا۔

(۲) اپنے کارخانوں میں مال کی پیداوار کے لئے خام اشیاء حاصل کرنا۔

اب غیر مرکزی طریق پیداوار اور سودیشی پر عمل کرنے والے نظام میں ان ہر دو کے لئے گنجائش نہیں رہتی۔ ہر گاؤں اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنی خام پیداوار کو استعمال میں لاتا ہے۔ اور اس طرح سارے ملک میں باہمی تبادلہ سے ہر ایک کی ضروریات بھی پوری ہو جاتی ہیں۔ اور خام اشیاء بھی زائد نہیں بچتیں۔ یہ تو لازمی ہے۔ کہ باہر سے کوئی اشیاء منگانے کی گنجائش نہیں رہتی۔ ہاں! ہو سکتا ہے۔ کہ خاص قدرتی ذرائع کی وجہ سے خام اشیاء ملکی ضروریات سے وافر بچ رہیں۔ مگر فقط

ایک تھوڑی سی چیز کی خاطر کوئی بھی ملک جنگ و جدل کے جوکھوں میں پڑ کر مستقل حکومت کے مالی بوجھ کو اپنے کندھوں پر لادنے کو تیار نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جس ملک کے لوگ غیر مرکزی پیداوار اور سودیشی اصولوں پر کاربند ہوں۔ ان کو غلام بنانے کی غلطی کوئی بھی ملک نہ کرے گا۔ اس طرح غلامی کو دور کرنے کے لئے بھی یہ ایک یقینی حل پیش کرتا ہے۔

آل انڈیا دیہاتی دستکاری ایسوسی ایشن کا قیام

مذکورہ بالا خیالات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے مہاتما گاندھی جی نے دیہاتی دستکاری ایسوسی ایشن قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ اور اس کے ایما پر آل انڈیا نیشنل کانگرس نے اپنے ۴۸ ویں اجلاس منعقدہ بمبئی میں بتاریخ ۲۷ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو ذیل کا ریزولیوشن پاس کیا گیا:۔

چونکہ سارے ملک میں کئی ایک انجمنیں سودیشی کی حمایت کے لئے کانگرس مینوں کی امداد کے ساتھ اور بغیر قائم ہو چکیں ہیں۔ اور چونکہ پبلک کے خیالات میں حقیقی سودیشی کی پہچان کے متعلق بہت سا انتشار پیدا ہو چکا ہے۔ اور چونکہ کانگرس کا اودیش شروع ہی سے عوام الناس کے ساتھ ہم آہنگی رہا ہے۔ اور چونکہ دیہات کی

دوبارہ تنظیم و تربیت کا کام کانگرس کے تعمیری پروگرام
کا جزو ہے۔ اور چونکہ ایسی دوبارہ دیہاتی تنظیم میں
علاوہ چرخہ کی مرکزی صنعت کے دیگر ایسی دیہاتی
دستکاریوں کو ترقی دینا بھی شامل ہے۔ جو مردہ ہو چکی
ہیں۔ یا ہو رہی ہیں۔ اور چونکہ یہ کام بھی ہاتھ کی کتائی
اور بنائی کی مانند ایسی یکسو اور خاص کوششوں سے
سرانجام پذیر ہو سکتا ہے۔ جو کانگرس کی سیاسی جدوجہد
سے بالکل الگ تھلگ اور آزادانہ طور پر عمل میں لائی جاویں
لہذا بذریعہ ریزولیوشن ہذا شری جے سی۔ کمار آپا
کو اختیار دیا جاتا ہے۔ کہ وہ مہاتما گاندھی جی کی زیرہدایت
ایک ایسوسی ایشن موسومہ آل انڈیا دیہاتی دستکاری
ایسوسی ایشن" بطور کانگرس کی سرگرمیوں کے ایک حصہ
کے قائم کریں۔ مذکورہ بالا ایسوسی ایشن کا کام دیہاتی
دستکاریوں کو دوبارہ بحال کرنا اور ترقی دینا۔ اور دیہاتیوں
کی جسمانی و اخلاقی ترقی کا حصول ہوگا۔ اس انجمن کو اپنی
کانسٹی ٹیوشن تیار کرنے۔ فنڈ جمع کرنے اور تمام دیگر
ایسے امورات کے سرانجام دینے کا کلی اختیار حاصل ہوگا۔
جو اس کی اغراض کے حصول کے لئے ضروری ہوں"۔

مذکورہ بالا ریزولیوشن میں تجویز کردہ انجمن ۱۴ دسمبر ۱۹۳۴ء کو

The all India village بنائی گئی۔ اس کا نام Industrial Association یا "اکھل بھارت گرام ادیوگ سنگھ" رکھا گیا۔ اور یہ ایسوسی ایشن ۱۹۳۴ء سے برابر مہاتما گاندھی جی کی رہنمائی میں اپنا کام سر انجام دے رہی ہے۔

ال انڈیا دیہاتی دستکاری ایسوسی ایشن کا پروگرام

شری بیت جے۔ سی۔ کمار آپا نے مذکورہ بالا ایسوسی ایشن کے پروگرام کے متعلق ذیل کا مضمون حوالہ قلم کیا ہے۔ Village Industries Association دیہات کے تمام مسائل کا حل کرنے کے ناقابل ہے۔ کئی ایک مسائل تو ایسے ہیں۔ جن کا حل سوائے حکومت کی امداد کے ہونا ممکن نہیں۔ کیونکہ اس کے لئے سارے ہندوستان پر سیاسی اور مالی اختیارات کی ضرورت ہے۔ لہذا اس قسم کی انجمن مجبور ہے۔ کہ وہ اپنی سرگرمیوں کو ایسے کاموں تک محدود رکھے۔ جو پرائیویٹ اختیار اور تنظیم سے عمل میں لائے جا سکیں۔ جس میں حکومت کے اختیارات و عملہ کو استعمال کرنے کی بالکل ضرورت نہ پڑے۔

دیہات کی صحت و صفائی

یہ تو ظاہر ہے۔ کہ کوئی انجمن جو دیہات سدھار کے کام کو سرانجام

دینا چاہتی ہے۔ سب سے اول اسے دیہاتیوں کی صحت کو درست بنانا ہوگا۔ کیونکہ دیہاتی ہی دیہات کی ساری سرگرمیوں کا مرکز ہے۔ اور جب تک وہ جسمانی طور پر تندرست نہ ہو۔ دیہات میں کسی قسم کی ترقی کی امید نہیں ہو سکتی۔ لہذا انجمن ہذا کے پروگرام کا آغاز دیہات میں صحت وصفائی کے کام سے کیا گیا ہے۔ یہ بات تو عیاں ہے۔ کہ جب تک گاؤں کے بازاروں۔ گلی کوچوں اور کھلی جگہوں کو صاف ستھرا نہ رکھا جائے گا۔ اور ان کے لئے پانی کے ذخیرہ کو خالص نہ بنایا جائے گا۔ تب تک دیہاتی وباؤں۔ کھجلی پھوڑا پھنسی اور بخاروں کے حملہ کا شکار بنتا رہیگا جو کہ اس کی پہلے ہی کمزور قوت کو اور بھی کمزور بنا دیتے ہیں۔ اس واسطے انجمن ہذا ان لوگوں کو جو دیہات سدھار کے کام میں دلچسپی رکھتے ہوں۔ دعوت دیتی ہے۔ کہ وہ سب سے اول دیہات میں صحت کے کام سے آغاز کریں۔ اس لائن میں کام کرنے کے لئے پہلے وہاں سڑکوں اور راستوں کو سادہ طور پر تیار کریں۔ گلی کوچوں سے کوڑا کرکٹ کے انبار اٹھائیں جن پر مکھی مچھر دیگر کیڑے جو امراض پھیلانے کا موجب بنتے ہیں پرورش پاتے ہیں۔ انسانی غلاظت کو صفا کرنے کے لئے بالکل سادہ اور ترقی یافتہ اور کم خرچ طریقے عمل میں لاویں۔ گاؤں کے کوڑوں اور نالیوں کو صاف ستھرا رکھیں۔ دیہاتیوں کو پانی کے ذخیروں کو صحیح طریقہ پر استعمال کرنے کا ڈھنگ سکھلاویں۔ اور تھوکنا روشنی کا انتظام رکھنا۔ کپڑے صاف رکھنا اور کھانے پکانے کے متعلق

صحت ورانہ عادات ان میں پیدا کریں۔

خوراک

علاوہ ازیں ایسوسی ایشن خوراک کی اصلاح پر بھی بڑا غور وخوض کر رہی ہے۔ اس کا مدعا یہ ہے۔ کہ خوراک کا ایسا جوڑ میل کیا جاوے جو دیہاتیوں کے لئے خریدنا آسان ہو۔ اور جس میں تمام ضروری طاقت ورانہ اجزا بھی پائے جاتے ہوں۔ کام کرنے کی طاقت دیہاتیوں میں کسی حد تک ردی خوراک کی وجہ سے بھی کم ہو گئی ہے۔ اس واسطے یہ لازمی ہے۔ کہ دیہاتیوں کی خوراک میں زندگی بخش اجزاء شامل کئے جاویں یا کم از کم اس بات کا خیال ضرور رکھا جاوے۔ کہ جو خوراک حاصل کرنے کی توفیق اس میں ہے۔ اس کا تھوڑا بہت طاقت ورانہ جز جو اس میں پایا جاتا ہے وہ زائل نہ ہونے پائے۔ اگر دیہاتی کا گذارہ صرف چاولوں پر ہو۔ جسے وہ اچار کے ساتھ نگل لیتا ہے۔ تو یہ ضروری ہو جاتا ہے۔ کہ اسے کم از کم وہ غذائیت تو ضرور حاصل ہو سکے۔ جو چاول میں ہوتی ہے۔ اس واسطے دیہاتی کو یہ سکھلانا چاہئے۔ کہ چاول کو ابالنے کے لئے صرف اتنا پانی استعمال میں لاوے۔ جس میں چاول ابل جاویں۔ ابلنے کے بعد اس کا پانی نچوڑ کر الگ نہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں چاولوں کی غذائیت کا بہت سا حصہ ملا ہوا ہوتا ہے

مزید براں دیہاتیوں کو یہ بھی سکھلانا چاہیے کہ وہ ہاتھ کے چھڑے ہوئے چاول استعمال میں لاویں۔ ہاتھ کے چھڑے ہوئے استعمال

ہیں لانے کا ایک فائدہ تو یہ ہے۔ کہ اس سے دیہاتیوں کو کام ملے گا۔ اور اس کا وہ خرچ بھی بچ جائے گا۔ جو Rice Mill والوں کو چھڑوائی کا دینا پڑتا ہے۔ لیکن اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ ہاتھ کا چھڑا ہوا چاول میڈیکل رائے کے مطابق مشین کے چھڑے چاول سے زیادہ غذائیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مشین کی گرمی سے چاول کی اندرونی طاقتور جزو جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ چاول کو پالش بھی نہ کرنا چاہیئے ورنہ پالش کرنے کے عمل میں اس کے اوپر کا وہ خول اوتر جاتا ہے۔ جس میں طاقتور جزو خوراک Berg, Berg پایا جاتا ہے۔ اور جو کے خلاف بطور رکاوٹ کام کرتا ہے۔ میڈیکل رائے اس امر میں بالکل متفق ہے۔ کہ غیر پالش شدہ چاول میں بمقابلہ پالش شدہ چاول کے غذائیت کی بہت زیادہ مقدار پائی جاتی ہے۔ کیونکہ غیر پالش شدہ چاول میں پروٹین۔ چربی اور دھات زیادہ مقدار میں ملتی ہیں۔

علاوہ ازیں غیر پالش شدہ چاول کبھی قبض پیدا نہیں کرتا لیکن پالش شدہ چاول ہمیشہ قبض کا موجب ہوتا ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر ایسوسی ایشن غیر پالش شدہ چاولوں کے استعمال پر زور دیتی ہے۔ اور دیہاتیوں کی بھلائی کے لیئے کام کرنے والے ہر ایک شخص کو لازم ہے۔ کہ وہ خود بھی ہاتھ کے چھڑے ہوئے چاول استعمال کرے۔ اور گاؤں والوں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دیوے۔ میڈیکل رائے یہ بھی ظاہر کرتی ہے۔ کہ گندم کا آٹا ہاتھ سے پیسا ہونا چاہیئے

اور کھانڈ کی بجائے گڑ استعمال میں لانا چاہیئے۔ کیونکہ مشین کی گرمی سے اور کھانڈ کو مصفا بنانے کے عمل میں غذائیت کا بہت سا حصہ زائل ہو جاتا ہے۔ اس واسطے ایسوسی ایشن ہذا خالص گندم کا دستی چکی کا آٹا اور گڑ کے استعمال کی تلقین لوگوں کو کرتی ہے علاوہ اجناس کے اب جڑی بوٹیاں، میوہ جات اور سبزیوں کو چیر پھاڑ کر کے تحقیقات کی جا رہی ہے۔ تاکہ گاؤں والوں کے لیئے طاقتور انہ و صحت ورانہ خوراک کی مناسب جز بندی کر کے ان کا استعمال گاؤں میں بڑھایا جائے ان تمام طریقوں سے انجمن ہذا امید رکھتی ہے۔ کہ وہ دیہاتیوں کے مرجھائے ہوئے جسموں میں تازہ زندگی پیدا کرنے کے قابل ہو سکے گی۔

مالی حالت کا سدھار

انجمن ہذا کا کام یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کا نام ہی اس بات کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ اس کا ابتدائی غرض دیہاتیوں کی مالی حالت کو سدھارنا ہے۔ آج دیہاتی کی حالت قابل رحم ہے۔ اس کو کوئی بھی منافع بخش پیشہ اختیار کرنے کو دکھائی نہیں دیتا۔ کیونکہ وہ تمام دستکاری جو پہلے اُسے مصروف رکھتی تھی۔ آج کل بڑی بڑی مشینوں نے وہ کام اس کے ہاتھ سے چھین لی ہے۔ نتیجہ یہ ہے وہ تمام تر اپنے گذارہ کے لیئے زمین کا دست نگر بن چکا ہے۔ لیکن زمین پہلے ہی اس سے زیادہ لوگوں کا بوجھ برداشت کر رہی ہے۔ جتنی کہ پیداوار

وہ دے سکتی ہے۔ ایسے حالات میں دیہاتی بچارا کیا کرے؟ اس موقع پر انجمن ہذا اس کی امداد کو پہنچتی ہے۔ اس نے دیہاتی دستکاریوں کی موجودہ حالت کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا بھی جو اچھی حالت میں جاری ہیں۔ اور ان کا بھی جو بند ہو چکی ہیں یا ہونے والی ہیں۔ اور لوکل حالات کے مطابق نئی نئی دستکاری رائج کرنا۔ پورانی کو پھر زندہ کرنا یا جاری شدہ کو ترقی پذیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور دیہاتیوں کے تیار شدہ مال کی زائد مقدار کی کھپت کے لیئے منڈیاں ڈھونڈھی جاتی ہیں۔ مگر یہ سب کچھ کرتے ہوئے کھلی مارکیٹ میں مشین کے مال کے ساتھ مقابلہ نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ یہ بات ہمارے سودیشی کے آدرش کے خلاف ہے۔ ہمارا مدعا تو یہ ہے کہ سودیشی کی حدود کے اندر رہتے ہوئے دیہاتی لوگ اپنے پاؤں پہ کھڑے ہو سکیں۔ یعنی فوری ضروریات کے لئے سب چیزیں تیار کرنے کے قابل بن جاویں۔ کیا ضرورت ہے کہ ہم پہلے روئی لنکا شائر اور جاپان کو بھیجیں۔ اور پھر وہاں سے کپڑا بنوا کر دیہاتوں میں واپس لایا جائے۔ جبکہ دیہاتی خود اپنی ضروریات کے لئے کپڑا بخوبی تیار کر سکتے ہیں؟ کیا وہ غریب انسان جس کی آمدنی بمشکل دس روپیہ ماہوار ہو یہ طاقت رکھتا ہے۔ کہ اپنے کپڑے دھلائی اور استری کے لئے یورپ میں بھیجے؟ ایسا خیال ہی دماغ میں لانا بیہودہ ہے۔ غریب انسان کو تو اپنے کپڑے خود ہی دھونے چاہییں۔ کیونکہ وہ ان کو یورپ بھیجنے

واپس لانے۔ وہاں دھلوائی کی مزدوری دینے اور محصول وبار برداری کے خرچ ادا کرنے کے بالکل ناقابل ہے۔ لیکن آج بیچارہ دیہاتی اس قسم کی بیہودگیوں کا برابر مرتکب ہو رہا ہے۔ جب بھی وہ اپنا کچا مال باہر یورپ کو بھیجتا ہے۔ اور اسے تیار شدہ مال کی صورت میں واپس لیتا ہے۔ حالانکہ وہ خود اپنے کچے مال کو تیار شدہ مال میں بخوبی تبدیل کر سکتا ہے۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اس طریقہ پر چلتے ہوئے دیہاتیوں کو دوہری لوٹ کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اس کو تیار شدہ مال کی قیمت بھی ادا کرنی پڑتی ہے۔ اور اپنے لئے بیکاری بھی سہیڑنی پڑتی ہے کہنے کو تو یہ بڑا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ کہ لنکا شائر اور جاپان دیہاتیوں کے لئے بڑا نفیس مال تیار کر دیتے ہیں۔ اور اسے محنت کی زحمت کشی سے بھی بچا دیتے ہیں۔ اس قسم کی دلائل ان لوگوں کے لئے جو ڈاکٹر۔ پروفیسر۔ وکیل، یا افسر لوگ ہیں۔ جن کی آمدنی کے دیگر ذرائع وسیع ہیں واقعی وزن رکھتی ہیں۔ لیکن ایسی جماعت تو ہندوستان کی آبادی کا بہت ہی قلیل حصہ ہے۔ آبادی کی بہت بڑی اکثریت تو کاشتکار ہے۔ جسے خون پسینہ کی طرح بہا کر اپنی روزی کمانی پڑتی ہے۔ ان کے لئے تو ایک پائی بھی قیمتی ہے۔ اور بیکاری تو ان کے لئے روزی سے محروم ہونے کے برابر ہے۔ لہذا انجمن ہذا یہ اپنا فرض اولین خیال کرتی ہے۔ کہ وہ دیہاتیوں سے ایسے کچے مال کی برآمد کو روکے۔ جو دیہاتیوں کے لئے اپنا مال تیار کرنے کے لئے

استعمال کی جا سکتی ہے۔ اور انہیں سکھلائے کہ وہ اس سے اپنا مال تیار کریں۔ غرض یہ ہے۔ کہ دیہات کی دولت کو باہر بھاگ جانے سے روکا جاوے۔ اور جو باہر جا رہی ہے اسے اندر رہنے پر مجبور کیا جاوے۔ تاکہ دیہاتوں میں خوشحالی نمودار ہو سکے۔ پرانے زمانہ میں ہندوستانی دیہات اپنی ضروریات کے لئے سب مال تیار کیا کرتے تھے۔ اس کی بعض دستکاریاں مثلاً سوتی کپڑا۔ ریشم، قالین پیتل اور ہاتھی دانت کے کام تو تمام دنیا کے لئے قابل رشک بنے ہوئے تھے۔ ایسی کوئی وجہ نہیں کہ آج ہندوستان کو ایک زراعتی ملک بن کر ہی رہنا پڑے۔ اب تو یہ بھی ڈر ہے۔ کہ اگر دیہاتیوں کی موجودہ مفلسی میں روز افزوں اضافہ اسی طرح جاری رہا۔ تو ایک دن عوام الناس کی مکمل تباہی کا موجب ثابت ہوگا۔ وہ پہلے ہی بھوکا مرنے کے مرحلہ پر گامزن ہے۔ اور اگر اس عمل کو نہ روکا گیا۔ اور دیہاتیوں کو زراعت کے ساتھ ساتھ کوئی امدادی دستکاری نہ سکھلائی گئی۔ تو پھر اس کے بچاؤ کی کوئی امید نہ رہے گی۔

دستکاری کی فضیلت

یہ تو سب کچھ ٹھیک ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے۔ کہ اس مایوس کن حالت سے نکلنے کا راستہ پرانے زمانہ کی دستکاریوں کو دوبارہ جاری کرنے سے نہیں۔ بلکہ سارے ہندوستان میں بڑے بڑے کارخانوں کا جال پھیلانے سے ہے۔ جو کہ ہر جگہ بیکاروں کی بہت

سی تعداد کو کام مہیا کر سکتے ہیں۔ اس علاج میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارے ملک کے حالات کے مطابق یہ بالکل ناکام رہتی ہے ہمارے ملک کی حالت یہ ہے۔ کہ کھیتی کے کام کاج سے فارغ ہو کر فرصت کے وقت کے لئے کسی اُمدادی کام کی ضرورت ہے۔ کوئی بھی کسان اپنی زمین کو چھوڑ کر کارخانوں میں جا کر کام نہیں کر سکتا۔ کیونکہ زمین کو بھی اس کی توجہ درکار ہے۔ اس کو تو ایک ایسے امدادی کام کی ضرورت ہے۔ جسے وہ اس وقت سر انجام دے سکے۔ جب اسے زمین کے کام سے فراغت ملے۔ علاوہ ازیں کارخانہ جات صرف خواہش کئے جانے پر فوراً تیار نہیں کئے جا سکتے۔ اور اپنے ملک کے تمام بیکار کسان مزدور کو کام مہیا کرنے کے لئے ہمیں بے شمار کارخانہ جات تیار کرنے ہوں گے۔ اور جب سارے لوگ اس طرح کارخانوں میں لگ جاویں۔ تو ایسے کارخانوں سے جو بے شمار مقدار مال کی پیدا ہو گی۔ اس کی بکری کہاں کی جاوے۔ دنیا میں پہلے ہی مال کی پیداوار کی زیادتی سے قیامت برپا ہو رہی ہے۔ اور مختلف ملکوں میں مارکیٹ حاصل کرنے کے لئے گلا کٹ مقابلہ جاری ہے۔ لہذا کارخانجات جاری کرنے والا علاج ایک ناممکن العمل تجویز ہے۔ مزید براں کارخانہ جات کی پیداوار تب مفید ہو سکتی ہے۔ جب مزدور تھوڑے ہوں اور مال کی کھپت کے لئے میدان وسیع ہو۔ لیکن ہمارے سامنے جو مسئلہ درپیش ہے۔ وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ ہمارے ملک میں ایک طرف کروڑوں مزدور ہیں

جنہیں کام مہیا کرنا ہے۔ دوسری طرف بدیشی مال کے انبار کے انبار ہیں جو ہمارے ملک میں ٹھونسے جا رہے ہیں۔ خواہ ہم چاہیں یا نہ۔ ہماری ضرورت یہ نہیں۔ کہ کام میں بچت کریں۔ بلکہ اپنے کروڑوں بھوک مرتے ہموطنوں کو کام مہیا کریں۔ ہم کارخانہ جات کھولنے سے یہ مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ کیونکہ کارخانہ جات آخر کار ہماری آبادی کے ایک بہت قلیل تعداد کو کام پہ لگا سکتے ہیں۔ ہمارا مقصد تو تب حاصل ہو سکتا ہے۔ جب ہم دیہاتی کو ایسی دستکاری سکھلاویں۔ جن سے وہ اپنی ابتدائی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اور اس طرح وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو سکے۔ اور اسے یہ ضرورت نہ رہے کہ وہ اپنی ابتدائی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اپنے گاؤں سے باہر کسی کا محتاج بنے۔ اسی طرح گاؤں کی تمام پیداوار گاؤں کے کئی خاندانوں میں تقسیم ہو جائیگی اور جب مال کی پیداوار اسی طرح تقسیم ہو جائے تو منافع بھی لازمی طور پر اسی طرح کئی گھرانوں میں تقسیم ہو جائے گا اور موجودہ حالت کی طرح چند ہاتھوں میں جمع ہونے سے بچ جائیگا۔ لوگ اپنے واسطے اور اپنے قریبی ہمسایہ کے واسطے مال بنانا سیکھ جائینگے تو پھر بڑے بڑے بیوپاریوں کی لوٹ گھسوٹ سے چھٹکارا حاصل ہو جائیگا اور باہر مال بھیجنے والے سوداگر بھی مفقود ہو جائیں گے۔ باہر مال بھیجنے والے دیہاتی کو اپنے کچے مال سے محروم نہ کر سکیں گے۔ اور نہ ہی اسے تیار شدہ مال کے لئے غیر ملکوں کا دست نگر بننا پڑے گا۔ دیہاتی اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جائے گا۔ اپنی ابتدائی ضروریات کے لئے اپنی ہی مشقت سے

مال خود تیار کر لیا کرے گا۔ اور زائد مال کو نہ بیچ ڈالے گا۔ اس طریقہ پر گامزن ہو کر دیہاتی کو اپنے مطلب کے لئے کوئی نہ لوٹ سکے گا۔ بلکہ جو سوداگر اُسے اپنے بیوپار کے لئے مال تیار کرنے کو کہے گا۔ وہ اُسے بَرملا کہہ سکے گا "میں اپنی ضروریات کے لئے مال خود تیار کر لیتا ہوں۔ اور میں اس میں خوش ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لئے مال تیار کروں۔ تو تمہیں میری شرائط پر مال تیار کرنے کے لئے معاوضہ ادا کرنا پڑے گا۔" انجمن ہذا کا مدعا یہ ہے۔ کہ وہ دیہات کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بنا دے۔ اس میں پورانی صنعتوں کو دوبارہ جاری کر کے یا نئی دستکاریوں کو سِکھلا کر اُسے اپنی ضروریات خود پیدا کرنے کے قابل بنا دیوے۔

اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ کہ ہم الگ تھلگ دنیا میں نہیں رہتے خواہ ہم چاہیں یا نہ۔ کارخانوں کا مال بہت بڑی تعداد میں آئے گا اور گاؤں کی دستکاری کے لئے ممکن نہیں۔ کہ وہ اس کا مقابلہ کر سکے۔ مگر جیسا کہ واضح کر چکے ہیں۔ ہماری انجمن کا مدعا مقابلہ کرنا نہیں۔ بلکہ صرف اپنی اور اپنے ہمسایہ کی ضروریات کے لئے ہی مال تیار کرنا ہے مثال کے طور پر اگر میں خود کاتوں اور اپنی ضروریات کے لئے خود ہی کپڑا بنا لوں۔ ایسے حالات میں جب فقط اپنے لئے ہی کاتتا ہوں۔ تو میرے لئے مشینی کپڑے کی سستی قیمت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ کیونکہ مجھے تو اپنے کھدر کے لئے نقدی ادا ہی نہیں کرنی پڑتی۔ لیکن پھر یہ اعتراض

کیا جائے گا۔ کہ ہر ایک دیہاتی اپنی ساری ضروریات کو خود تیار نہیں کر سکتا۔ جو چیز وہ خود تیار نہیں کر سکتا۔ وہ اُسے کھلے بازار میں خریدنی پڑے گی۔ مثلاً کاغذ۔ جوتا وغیرہ۔ ایسی حالت میں دیہات کا بنا کاغذ اور جوتا مشینی تیار شدہ مال کے ساتھ مقابلہ میں ضرور آئیں گے۔ اس کے متعلق ہمارا جواب یہ ہے۔ کہ جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے۔ نئے نئے ترقی یافتہ طریقوں پر تیار شدہ دیہاتی مال کوئی وجہ نہیں۔ کہ وہ اوصاف کے لحاظ سے مشینی مال سے ادنےٰ ثابت ہو۔ برخلاف اس کے مقابلہ میں وہ اعلےٰ ثابت ہو سکے گا۔ کیونکہ مغربی ممالک میں پہلے ہی ہاتھ کے تیار شدہ مال کو کارخانہ کے تیار شدہ مال پر ترجیح دی جاتی ہے۔ بلحاظ قیمت بھی دیہاتی مال جبکہ مزدور سستے ہوں۔ جیسا کہ ہندوستان میں ہیں۔ کارخانہ کے مال کے مقابلہ میں سستے مل سکتے ہیں۔ مزید براں جب انسانی توجہ اور دماغ فرد واحد کے لئے ہاتھ سے کام کرنے والی مشین بنانے پر مرکوز ہو گا۔ Sewing Machine کی مانند بجائے بہت بڑے پیمانہ پر مال پیدا کرنے والی مشینوں کے ایجاد کرنے کے۔ تو ایک شخص کے کام کی مقدار آسانی سے بڑھ جائیگی۔ اور وقت بھی بچے گا۔ نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ ہاتھ کے بُنے مال کی قیمت بھی اتنی ہی کم ہو جائے گی جتنی کہ مشینی مال کی ہوتی ہے۔ اس واسطے ہمارے پروگرام میں ایسی مشین کے لئے کافی گنجائش رکھی گئی ہے۔ جو کہ شخصی محنت کو امداد پہنچا سکے جیسا کہ Sewing Machine کی تمثیل پہلے پیش کی جا چکی

ہے۔ لیکن بڑے پیمانہ پر مال پیدا کرنے والی مشین کے لئے ہمارے پروگرام میں کوئی گنجائش نہیں۔ کیونکہ وہ پیداوار کی باگ ڈور مرکز کے ہاتھ میں دے دیتی ہے اور کاریگر کو غلام بنا دیتی ہے

وسیع پیمانہ کے کارخانہ جات کی ضرورت

یہ تو صحیح ہے۔ کہ ملک کی ساری صنعت چھوٹے پیمانہ پر ہی تیار نہیں ہو سکتی۔ اس میں مرکزی پیداوار کے طریقوں پر بھی عمل کرنا پڑے گا۔ مثلاً رفاہِ عامہ کی اشیاء کی تیاری کے لیے۔ لیکن یہ کام کسی فرد واحد کے سپرد نہیں ہوگا۔ بلکہ حکومت اپنے انتظام میں تیار کروائے گی۔ اور سب کے لئے یکساں طور پر مفید ہوں گی کچھ بڑے پیمانہ پر چلنے والے کارخانہ جات کو آپریٹو سوسائٹیوں کے ذریعہ بھی چلائے جا سکیں گے۔ چونکہ یہ انجمن ہذا کے پروگرام میں داخل نہیں۔ لہذا ان کا ذکر ہم یہاں نہیں کرتے۔

شہریوں اور غیر ملکوں کے لئے مال تیار کرنا

سودیشی کے اصول کے مطابق دیہات میں جو مال تیار کیا جائیگا وہ دیہاتیوں کی اپنی ضروریات کے لئے ہوگا نہ کہ شہریوں اور غیر ملکوں کی ضروریات کے لئے۔ مگر دیہاتی بعض حالات میں ایسا مال بھی تیار کر سکے گا۔ جو اس کی اپنی ضروریات کے لئے نہ ہو۔ بشرطیکہ اس مال کی حاضر ضرورت موجود ہو۔ (اس صورت میں ضرورت کے مطابق مقدار ہی میں مال تیار کیا جا سکے گا) اور وہ مال اس گاؤں۔ کے کچے مال سے

تیار ہو سکے۔ اور کئی ایک دیہاتیوں کو کام بھی مہیا کر سکے۔ دیہاتیوں کو مثال کے طور پر انڈیپنڈنٹ اور گھڑیاں تیار کرنے میں کوئی فائدہ نہیں۔ کیونکہ اس کی تیاری کے لئے مشین اور کچا مال ان کے نجی گاؤں میں نہیں مل سکتے۔ اور ان چیزوں کی ضرورت بھی چند شہری لوگوں تک محدود ہوتی ہے۔ اور یہ بیوپار موجودہ حالت میں بھی بہت قلیل التعداد گھرانوں کو کام مہیا کرتا ہے۔ علاوہ ازیں مغرب نے ان صنعتوں میں اس قدر دماغ اور سرمایہ خرچ کیا ہے۔ کہ دیہاتیوں کے لئے ایسا مال تیار کرنا کسی طرح مفید ثابت نہ ہو سکے گا۔ لیکن گوڑ کی تیاری میں ایسی کوئی دقت نہیں۔ کیونکہ اس کی تیاری کے لئے کچا مال ہندوستان میں کم و بیش ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ اس کی کھپت بھی بہت بھاری تعداد میں ہوتی ہے۔ اور اسی وجہ سے یہ اکثر گاؤں میں بہت سے خاندانوں کو روزی مہیا کر سکتا ہے۔ ایسی ہی صنعتیں ہیں۔ جن کو انجمن ہذا فروغ دینا چاہتی ہے۔

کام کرنے کا اصول

ایسی صنعتوں میں جسے دیہاتی تجارتی نکتہ خیال سے ہاتھ میں لیتا ہے۔ ایسوسی ایشن اس بات پر زور دیتی ہے۔ کہ اس میں ہر ایک کاریگر کو کم از کم گذارہ کے لئے مناسب مزدوری ضرور ملنی چاہئے اس واسطے یہ بھی انتظام کیا جا رہا ہے۔ کہ مال تیار کرنے والوں کو بھی مال بیچ کر کم از کم گذارہ کے اصول پر منافع حاصل ہونا چاہیئے۔ اس

دفت ہمارے ملک میں نہایت ہی قلیل اجرت دینے والی صنعتوں میں سے ایک صنعت سوت کی کتائی ہے۔ جو کہ موجودہ حالات میں کاریگر کو صرف ایک پیسہ فی گھنٹہ کی اجرت دلاتی ہے۔ ایسی حالت کو اب برداشت نہیں کیا جائے گا۔ کاتنے والے کو مزدوری اس کے گذارہ کے مطابق ادا کی جائے گی۔ گذارہ کا اندازہ یہ ہوگا۔ کہ اس سے ایک بالغ انسان کو سائنٹفک طریقہ پر تجویز کی گئی کم از کم خوراک مہیا ہو سکے۔ یہ تو پرسچ ہے۔ کہ موجودہ حالات میں گاؤں والوں کی خوراک اس درجہ سے بالکل کمتر ہوتی ہے۔ لیکن انجمن ہذا یہ چاہتی ہے۔ کہ جب وہ دیہاتیوں کو اچھی اور طاقتور غذا استعمال کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ اور اس کے حصول کے ذرائع بتلانا بھی اس کا فرض ہو جاتا ہے۔ مزدوری کی بنیاد اس اوسط مال پر رکھی جائے گی۔ جو ایک ہشیار کاریگر آٹھ گھنٹہ روزانہ کام کرکے تیار کرے گا۔ اس طریقہ پر کام کرنے کا نتیجہ مجبوراً یہ ہوگا۔ کہ کھادی اور اس مال کی قیمت جو کہ مقررہ اجرت سے کم پر تیار ہوتے ہیں۔ بڑھ جائے گی۔ اور اس کی بکری بھی کم ہو جائے گی۔ مگر مہاتما گاندھی جی جو کہ اس انجمن کے روح رواں ہیں۔ اس بات سے نہیں گھبرائے۔ وہ اس بات کو ترجیح دیتے ہیں۔ کہ ایسے مال کی تجارت بھلے ہی بند ہو جائے بجائے اس کے کہ دیہاتی کو لوٹا جائے۔ اور اُسے اس قدر غیر انسانی کم مزدوری ادا کی جاوے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ہماری سکیم کے مطابق دیہاتی اپنی ضروریات

زندگی خود تیار کر لیتا ہے۔ لہذا یہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کہ دیہاتی اپنی ضروریات کے لئے قیمت ادا نہ کر سکے گا۔ عملی طور پر اس کے یہ معنے ہیں۔ کہ جو لوگ اپنے اردگرد کے دیہاتیوں کے متعلق اپنے فرائض سے آگاہ ہیں۔ وہ اسے اپنا فرض بنالیں گے۔ کہ وہ اس کے مال کو زیادہ قیمت ادا کر کے بھی خریدیں۔ تاکہ وہ ایک ایسے نظام کی امداد نہ کریں۔ جو کہ دیہاتیوں کی ناجائز لوٹ گھسوٹ پر پرورش پاتا ہے۔ کم ازکم گذارہ مقرر کرنے کی تہ میں اخلاقی جذبہ کام کرتا ہے عملی مشکلات اس راستے میں یقیناً رونما ہوں گی۔ لیکن اپنے طریقہ کی صداقت و انصاف میں ہمارا یقین ہی ہمیں ان مشکلات پر غالب آنے میں امداد کرے گا۔ ہم آخر کار اس قابل ہو سکیں گے کہ دنیا کو عملی طور پر دکھا دیں۔ کہ انجام کار انصاف اور سچائی ہی مالیات کی مشکلات کو حل کرنے کا واحد کامیاب طریقہ ہو سکتا ہے۔

دیہاتی دستکاری کے معاونوں کا فرض

انجمن ہذا کے ساتھ مل کر کام کرنے والوں کے سامنے اس وقت سب سے اہم کام یہ ہے۔ کہ وہ دیہات کی وسیع پیمانہ پر Survey چھان بین کریں۔ وہ دریافت کریں۔ کہ کون سی دستکاریاں ہیں۔ جو اس وقت دیہات میں جاری ہیں۔ اور کیسی حالت میں ہیں۔ دستکاریوں کے لئے کون کون سا کچا مال وہاں سے دستیاب ہو

سکتا ہے۔ پہلے کون کون سی دستکاریاں اس گاؤں میں جاری رہ چکی ہیں۔ اس کی تیاری کے متعلق کس قدر علم یا سامان ابھی موجود ہے اور کہاں تک وہ منافع بخش طور پر دوبارہ سرسبز کی جا سکتی ہیں۔
انجمن ہذا قدرتی طور پر ان دستکاریوں میں سے صرف اس کی خاص طور پر امداد کر سکے گی۔ جو وسیع پیمانہ پر استعمال کی جا سکتی ہوں۔ اور جس کی تیاری میں سرمایہ اور سامان کم خرچ ہو۔ جن کا اثر کثیر تعداد پر پڑے۔ اور جسے ہر دیہاتی بغیر خاص بیرونی امداد کے خود تیار کر سکتا ہو۔ ایسی دستکاریاں جو ان شرائط پر پوری اترتی ہیں۔ اور جنہیں دوبارہ منافع بخش طور پر جاری کیا جانا چاہیئے۔ مفصلہ ذیل ہیں :-

فوراً ہاتھ میں لینے کے قابل دستکاریاں

کاتنا۔ بننا۔ چمڑا رنگنا۔ تیل نکالنا۔ گڑ اور کاغذ تیار کرنا۔ ہاتھ سے چاول چھڑنا۔ چکی یا خراس سے آٹا پیسنا۔ شہد تیار کرنا۔ ان سب کے لئے سوائے شاید کاغذ کے ضروری سامان عملی طور پر ہندوستان میں ہر جگہ مل جاتا ہے۔ ان کے لئے بہت تھوڑا سرمایہ کی ضرورت ہے۔ ضروری ہنر بھی آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور کھپت بھی بہت زیادہ ہے۔ لہذا اس کو انجمن کے ضروری پروگرام میں شامل کر لیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر چمڑے رنگنے کا کام Tanning لیجئے۔ ہر گاؤں میں مردہ جانور پائے جاتے ہیں۔ یہ جانور موجودہ

حالا منت میں عموماً پھینک دیے جاتے ہیں۔ یا تو بعض لوگ اُسے کاٹ کر کھانے کے لیے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالتے ہیں۔ یا گدھ، چیلیں اور کتے اسے اپنا نوالہ بناتے ہیں۔ چمڑا اور ہڈیاں عموماً بالکل ضائع جاتی ہیں۔ سارے کا سارا وہ حلقہ سڑاند (بدبو) سے خراب ہو جاتا ہے۔ جہاں پر کھلے میدان میں یہ پھینکے جاتے ہیں۔ بجائے اس کے اب دیہاتیوں کو انجمن ہذا کی طرف سے یہ سکھلایا جاتا ہے۔ کہ ایسے مردار کس کس کام میں آتے ہیں۔ پہلے تو مردار کی کھال ادھیڑی جاتی ہے۔ پھر اس کھال کو نمک لگا کر رنگائی کی جگہ پر بھیجا جاتا ہے۔ جہاں اس کی صفائی کی جاتی ہے۔ اور اُسے قابل استعمال چمڑے کی شکل میں لایا جاتا ہے۔ کھال ادھیڑ کے صفا کرتے وقت جو چھیچھڑا وغیرہ اُترتا ہے اس سے سریش (glue) تیار ہوتا ہے۔ انتڑیوں سے چربی الگ کر لی جاتی ہے۔ اور خالی انتڑیاں گٹ (catgut) تیار کرنے کے کام آتی ہیں۔ جس سے Tennis کے بیٹ اور Violin کے تار بنتے ہیں۔ ہڈیاں اور چھیچھڑے ملے گوشت کو سات آٹھ گھنٹے تک پانی میں اُبالا جاتا ہے۔ اس سے چربی تیر کر اُوپر آ جاتی ہے۔ اس طرح چربی الگ کر کے نرم کرنیکے کام میں و دیگر صنعتی کاموں میں استعمال ہوتی ہے۔ اچھی طرح اُبلے ہوئے گوشت اور ہڈی کو دھوپ میں سُکھایا جاتا ہے۔ اور پھر کوٹ کر چُورا بنا لیتے ہیں۔ یہ چُورا ایک بڑھیا قسم کی کھاد کا کام دیتا ہے۔ اور فوراً بک جاتا ہے۔

سینگ کنگھیاں اور چاقو کے دستے وغیرہ بنانے کے کام آتے ہیں۔
ہڈیاں بھی ان کاموں کے لئے استعمال ہو سکتی ہیں۔ جب آدمی اس
بات پر غور کرتا ہے۔ کہ مردہ جانور کا تقریباً ہر حصہ کام میں لایا جا
سکتا ہے۔ اور مختلف قسم کی دستکاریوں کے رائج کرنے کا موجب
بنتا ہے۔ تو اس وقت اس امر کا احساس ہوتا ہے۔ کہ ہمارے ملک
میں لاعلمی کی وجہ سے کس قدر قیمتی چیزیں ضائع جا رہی ہیں۔ یہی ان
لوگوں کے سامنے کام ہے۔ جو انجمن ہذا کے ساتھ مل کر کام کرنے والے
ہیں۔ کہ وہ ان چیزوں کی طرف خاص طور پر دھیان دیویں۔ اور
اس ظاہرا ردی چیز سے دیہاتیوں کے لئے کام اور دولت پیدا
کر کے دکھائیں۔

دیہات میں کاریگروں اور ماہروں کی کمی

بہت سی وجوہات میں سے جنہوں نے عوام میں انتہائی درجہ کی
مفلسی پیدا کی ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہے۔ کہ گذشتہ صدی میں دیہات
سے ذہین اور سمجھدار لوگ باہر نکل گئے ہیں۔ ان لوگوں نے محکمہ تعلیم
کا کام شروع کر دیا۔ کلرک شپ اختیار کر لی۔ یا گورنمنٹ کے عہدہ جات
حاصل کر لئے۔ اور اس طرح گاؤں کے کام کے نہ رہے۔ بعضوں
نے درمیانی آدمیوں کا پیشہ اور آڑھتیوں کا کام اختیار کر لیا۔ جن
کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ دیہاتی دستکاریاں ایسے سمجھدار آدمیوں کی خدمات

سے محروم ہوکر تباہی کے گڑھے میں گرتی گئیں۔ کسی بھی دستکاری کے کام کو کامیابی سے چلانے کے لئے تین طبقہ کے آدمیوں کی ضرورت ہے۔ ا۔ بیوپاری کاریگر اور مزدور۔ پہلے دو طبقوں کے لوگ تو شہروں اور بڑے بڑے قصبوں میں چلے گئے۔ اور صرف مزدور طبقہ باقی گاؤں میں رہ گیا۔ جس کے سپرد گاؤں کی دستکاری کا کام سونپا گیا۔ مگر ان کے پاس ایسے کام کو سرانجام دینے کی قابلیت نہیں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کہ گاؤں میں دستکاری کا کام اس قدر قابل رحم حد تک نامکمل حالت میں ہے۔ دیہاتی دستکاری کی یہ انجمن اس لئے یہ کوشش کر رہی ہے۔ کہ اس حالت کو سدھارا جائے۔ دیہاتی کاروبار میں بیوپار کے طریقوں اور ٹیکنکل ہنر کو ساتھ جوڑا جائے۔ جس سے ان تینوں طبقات میں مساوات قائم کی جاوے۔ جو کہ صنعتی کاروبار کو چلانے کے لئے لازمی ہیں۔ اوپر کی مثال پر غور کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے۔ کہ مرداروں کو ٹھکانے لگانے کا نقصان وہ طریقہ جو اس وقت دیہات میں رائج ہے۔ وہ اس بات کا نتیجہ ہے۔ کہ دیہاتیوں کو اس بات کا علم نہیں۔ کہ مردار کو کس کس کام میں لائے جا سکتے ہیں۔ اور کن طریقوں سے انہیں کارآمد حالت میں لایا جاتا ہے۔ اس کے لئے ٹیکنکل تعلیم کی ضرورت ہے جو دیہاتی کو حاصل نہیں اور صرف ایسی تعلیم کی بدولت ہی دیہاتی ایسے کاموں کو سرانجام دینے کے

قابل ہو سکتے ہیں۔ جب ٹیکنیکل ماہر دیہاتی کو صنعتی پیداوار کے طریقوں سے آگاہ کر دے گا۔ تو پھر ایک ماہر بیوپاری کی ضرورت ہو گی۔ جو اس صنعت کو پائیدار کاروباری طریقہ پر منظم کر دیگا۔ دیہاتی دستکاری کی انجمن ایسے ماہرین کو شہر اور قصبوں سے کھینچنا چاہتی ہے۔ اور ایک دفعہ پھر انہیں گاؤں میں لاکر دیہاتی دستکاری کی ترقی اور سرسبزی کے لئے کام کرنے پر لگانا چاہتی ہے۔

ریسیرچ کا کام

ایک اور اہم کام جو انجمن ہذا نے اپنے سامنے رکھا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ وہ مال کی تیاری کے لئے بہترین طریقوں کی تلاش کے لئے ریسیرچ کا کام جاری رکھے۔ تاکہ ایسی ایسی تدابیر عمل میں لائی جاویں۔ جس سے دیہاتیوں میں تیاری مال کی طاقت بڑھے اور مال بھی بلحاظ اوصاف بہتر حاصل ہو سکے۔ اس وجہ سے مختلف قسم کی دستکاریوں کے متعلق مثلاً تیل نکالنے۔ ڈیری فارم کا کام۔ شہد کی مکھی پالنا۔ کاغذ بنانا۔ چمڑا رنگنا۔ سوت کاتنا اور بننا۔ وغیرہ کے متعلق ایسوسی ایشن کے ہیڈ کوارٹر میں تجربات کئے جا رہے ہیں۔ اور دیگر دستکاریوں کے متعلق بھی ریسیرچ ہو گی۔ جیسے جیسے وقت آتا جائیگا۔

براڈکاسٹ

مزید براں سارے ملک میں دیہاتی دستکاریوں کے ساتھ وابستہ

ہونے کے سبب انجمن ہذا امید رکھتی ہے۔ کہ وہ ایک علاقہ کی پیداوار کو دوسرے علاقہ کو بذریعہ براڈکاسٹ بتلانے کے بھی قابل ہو سکے گی۔

عجائب گھر

امید کی جاتی ہے۔ کہ بہت جلدی ایسوسی ایشن ہذا دیہاتی دستکاریوں کے متعلق ایک عجائب گھر قائم کرے گی۔ جس میں نہ صرف وہ مال رکھے جائیں گے۔ جو مختلف دیہات میں تیار کئے جاتے ہیں۔ بلکہ ان مالوں کو تیار کرنے کے طریقے سکھلانے کا بھی مظاہرہ کیا جاسکے گا۔ جس سے نمائش میں آنے والے لوگ یہ جان سکیں۔ کہ کون کون سے مال تیار کرنے کے طریقے و اشیاء ان کے اپنے دیہات میں مفید ہو سکتے ہیں۔ عجائب گھر کے ساتھ ملحقہ ایک لائبریری ہو گی۔ جس میں وہ تمام کتب موجود ہوں گی۔ جن میں ان صنعتوں کو جن کی نمائش کی جائے گی۔ بنانے کے طریقے تحریر ہوں گے۔ کچھ عرصہ بعد ایک دیہاتی ٹریننگ مرکز بھی تیار کیا جاوے گا۔ جہاں پر دیہات میں کام کرنے والے ورکروں کو تربیت دی جائے گی۔

موجودہ حالات میں ایسے ہی کچھ طریقے ہیں۔ جن سے انجمن ہذا دیہاتی ترقی کے مسائل کو حل کرنا چاہتی ہے۔

اعتراضات کے جوابات

مذکورہ بالا سطور میں ہندوستان کی ذہنی اور عملی مشکلات اور ان کا حل وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ مشکلات کے حل کیلئے تعمیری اور عملی پروگرام بھی واضح کیا گیا ہے۔ مگر اس پر ایک خاص اعتراض کیا جاسکتا ہے جس کا جواب دینا ہمارے لئے ضروری ہے وہ یہ کہ مشکلات کے ضمن میں اقتصادی خرابی کیلئے جو کچھ بڑے پیمانہ پر جاری شدہ صنعتی کارخانوں کے متعلق تحریر کیا گیا ہے۔ وہ مبالغہ آمیز ہے اس کے متعلق کوئی اعداد و شمار کی بنا پر شہادت پیش نہیں کی گئی۔ مزید براں سچائی اور عدم تشدد کو علاج کے ضمن میں جس طریقہ پر بیان کیا گیا ہے۔ وہ مہاتما گاندھی جی کے خیالات کا عکس ہیں۔ جو ابھی تک چند ہندوستانیوں کو چھوڑ کر کسی غیر ہندوستانی کو اپیل نہیں کر سکے۔ اور پھر جنگ کے زمانہ میں بیرونی حملہ آور کا مقابلہ تو بالکل ناقابل فہم چیز ہے۔

اس اعتراض کے جواب میں گذارش ہے۔ کہ جنگ نے سب چیزوں کو کٹھالی میں ڈال دیا ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ اقتصادیات کی مقبول عام تھیوریاں بھی اس کٹھالی میں پگھل چکی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دنیا جنگ و تشدد سے تنگ آچکی ہے ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کی جنگ کے بعد بھی دنیا کی یہی حالت تھی۔ مگر ۲۰ سال کے بعد ہی ہمیں ایک بار اس سے زیادہ ہیبتناک جنگ کا سامنا کرنا پڑ گیا ہے۔ اس جنگ سے کینہ اور نفرت کے بیج اور بھی گہری جڑیں پکڑ لیں گے۔ اس کی وجہ مختصراً یہ ہے کہ ہم تشدد سے پیچھا تو چھڑانا چاہتے ہیں لیکن تشدد کے خاتمہ کیلئے جو لوازمات ہیں۔ ان سے بالکل بے بہرہ ہیں اس

کہ راستہ میں بظاہر مشکلات بھی ہیں۔ خاص چیزیں ایسی ہیں۔ جو ہماری زندگی کا جزو بن چکی ہیں۔ مثلاً مشینری، صنعت و حرفت اور ہمارا خیال ہے۔ کہ یہ تو ابد تک ہمارا پیچھا نہ چھوڑیں گی۔ ہمیں اس بات سے اتفاق ہے۔ کہ بیکاری ایک زحمت ہے۔ لیکن جب ہم اس کا علاج سوچنے بیٹھتے ہیں۔ تو سب سے اول درجہ پر Industrialisation صنعت و حرفت کو لیتے ہیں سرمایہ داری کو تو ہم زحمت سمجھتے ہیں۔ لیکن Industrialisation کو ہم قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ Industrialisation کے نتائج کا ذرا مطالعہ کیجئے:۔

"پادری لالیمنڈ (Father Lallemand) جو امریکن پروفیسر ہیں۔ اپنے ایک مشہور مضمون کے دوران میں جو انہوں نے The New Review کے تازہ پرچہ میں شائع کرایا ہے ان واقعات کو لکھتے ہیں جو انہوں نے La Vie Intellectuelles مورخہ ۲۵ر اکتوبر ۱۹۳۶ء سے اخذ کئے ہیں"! وہ کہتے ہیں کہ سب سے "پہلا اثر مشین کا یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ آدمیوں میں بیکاری پھیلاتی ہے"!

آج کل کھدائی کے کام میں Ingersoll Spade (انگرسال کدال) استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ کدال چار صد آدمیوں کا کام سرانجام دے سکتی ہے۔ سنہ ۱۸۵۰ء میں ایک آدمی معمولی کلہاڑے Pick axe سے ۸۰۰ ٹن کچے لوہے کے

ڈھیلے کی کھدائی ایک سال میں ختم کر سکتا تھا۔ آج بجلی کے Drill
درانتی کی مدد سے ایک آدمی ۲۴۰۰۰ ٹن کھود سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں
پاور ہاؤس میں ایک آدمی سے H.P. 100 حاصل ہو سکتا تھا۔ اب
Dnieper Electric Central میں وہ لوگ فی
مزدور H.P. 20,000 حاصل کر رہے ہیں۔ غرضیکہ انسان نے اپنے
آپ کو بہت سستا بنا لیا ہے۔ اور اب وہ اس کوشش میں مصروف
ہے۔ کہ وہ اپنے آپ کو اور بھی سستا بنا دے۔"

تمام "ترقی" کے معنے ہیں انسان کی قیمت میں تنزل۔

سنہ ۱۹۱۴ء میں ایک موٹر کار تیار کرنے میں ۱۱۹۷ گھنٹے خرچ ہوتے
تھے۔ اور سنہ ۱۹۳۴ء میں کل ۹۳ گھنٹے لگتے ہیں۔

سنہ ۱۹۲۲ء میں ایک مزدور ایک دن میں ۴۵۳ اینٹیں بناتا تھا۔
لیکن سنہ ۱۹۳۴ء میں وہ ۱۵۰۰ تیار کر لیتا ہے۔

فرانس کی سگرٹ فیکٹری Hemet میں۔ جو ایک منٹ میں ۲۵۰۰
سگرٹ تیار کرتی ہے۔ سنہ ۱۹۳۲ء میں ۲۰۰ عورتیں کام کرتی تھیں لیکن
سنہ ۱۹۳۵ء میں دو سے زیادہ درکار نہیں۔ گویا کہ تین ہی سالوں میں
مشین نے مال کی پیداوار اس کثرت سے بڑھا دی ہے۔ کہ انسانی
مشقت کی ضرورت کو ۱۲۷ گنا کم کر دیا ہے۔

یہ اندازہ کیا گیا ہے۔ کہ سنہ ۱۹۳۴ء میں اٹلانٹک کے پار جانے والی ایک

کشتی کو کوئلہ بھرنے کے لئے ۲۵۰ مزدور ۲۰۰۰ گھنٹے میں کام سرانجام دیتے تھے۔ لیکن اس سے اگلے سال ہی ایسی کشتی کو اتنی ہی طاقت بذریعہ پیٹرول مہیا کرنے کے لئے صرف دو آدمی ۱۶ گھنٹے تک کام کر کے پورا کر سکتے تھے۔

یہ اعداد و شمار کوئلہ کے متعلق ہیں۔ دوسرے قسم کے کاموں میں تو مشقت میں کمی بہت ہی زیادہ واقع ہو چکی ہے۔ یہ خیال کرنا بھی ایک دھوکا ہے۔ کہ مشین کی زیادتی کی وجہ سے جو بیکاری پیدا ہوتی ہے۔ وہ عارضی ہے۔ کیونکہ پیداوار کی زیادتی سے کام کرنے کے نئے نئے راستے نکل آتے ہیں۔

"قادر Lallemand کہتا ہے۔ کہ واقعات بار بار اس دلکش تھیوری کو بالکل جھٹلاتے ہیں۔ گذشتہ خوشحالی کے زمانہ میں بیکاری دن بدن متواتر بڑھتی چلی گئی ہے۔ جب کہ ذخیرہ بے انداز موجود تھا۔ یہ بیکاری سنہ ۱۹۲۰ء میں سب سے زیادہ تھی۔ یہ وہ زمانہ ہے۔ جب کہ اقتصادی تباہی کا ابھی تک خواب و خیال بھی نہ تھا۔ U.S.A. میں یہ ترقی کرتی گئی۔ حالانکہ اس ملک کے ذرائع بے شمار ہیں۔ اور وہاں کی گورنمنٹ نے بیکاری کو دور کرنے کے لئے اپنی ایڑھی چوٹی تک کا زور لگایا۔ M. P. Barrand کے اندازہ کے مطابق تقریباً تین کروڑ آدمی کے لئے کچھ کرنے کو نہیں۔ سوائے اس کی

جان کے۔ اور ان تین کروڑ آدمیوں کے کندھوں پر اندازاً دس کروڑ دیگر لواحقین کے گزارے کا بوجھ ہے۔ ان کو روزمرہ کی بڑھتی ہوئی مشینری نے نکما بنا دیا ہے۔ اب اُن کے لواحقین کا کون پرسان حال ہے؟ یہ ایک حقیقی مسئلہ ہے۔ اور جب تک یہ انڈسٹریل ترقی جاری رہے گی یہ مسئلہ زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتا چلا جائے گا۔ کاروبار میں مقابلہ ہے۔ مقابلہ کے لئے سستی قوت کی ضرورت رہتی ہے۔ اور اس طرح مشین دن بدن انسانی مشقت کو کام کے میدان سے باہر نکال رہی ہے۔

کام کے گھنٹوں میں تخفیف اور مزدوروں کے لئے زیادہ فرصت کا مہیا کرنا بھی ایک مسئلہ ہے جس کے حل پر بہت کافی خرچ اٹھتا ہے۔

پروفیسر Lallemand بعد ازاں مشین کی زیادتی کا دوسرا نتیجہ بیان کرتے ہیں۔ یعنی سامان کی پیداوار بہت کثرت سے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

بڑے بڑے بیوپاری اعداد و شمار کے شائقین ہوتے ہیں۔ اور جب انہیں اپنے گوشوارہ (Balance Sheet) کے خوبصورت توازن میں کمی و بیشی دکھائی دے۔ تو وہ زائد مال کو تباہ کر دیتے ہیں سامان کو کم کر دیتے ہیں۔ لیکن قیمتوں کو نہیں گرنے دیتے۔ اور اس

طرح بڑے بڑے ذخیروں کے ہوتے ہوئے قحط کا سماں باندھ دیتے ہیں۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں اس طریقہ کو سب سے بہترین علاج خیال کیا گیا اور انہوں نے ۸۶۰۰۰ ۸ چھکڑے گندم ۴۴۰۰۰ اچھکڑے چاول ۳۲۰۰۰ بوری کافی۔ ۲۰۰۰۰۰ ٹن کھانڈ ۶۰۰۰۰ سور۔ اور ۸۰۰۰۰ دیگر مویشی تباہ کر ڈالے۔ بعض حالات میں تو وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے۔ یعنی شرابی انگوروں کے انہوں نے نہ صرف ذخیروں کو ہی تباہ کیا۔ بلکہ اس کی بیلوں کی جڑیں ہی اکھڑوا دیں۔ کچھ چیزوں کو تو کھدر کے گڑھوں میں بھر دیا۔ کچھ کو بھٹیوں میں جلا ڈالا۔ غرضیکہ اپنی حسب منشار طریقوں پر انہیں تباہ کیا۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے ان کے دلوں میں ذرا بھی یہ خیال نہ آیا۔ کہ علاقے کے علاقے تو بھوکوں مر رہے ہیں۔ تین کروڑ بیکار اور دس کروڑ ان کے بھروسہ پر گذر کرنے والے سب۔ اُن کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ فادر لالیمنڈ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خیال کرتا ہے۔ کہ اس کا علاج Ration alized تقسیم مال ہے۔ یعنے حصہ رسدی سامان کی تقسیم کرنا چنانچہ وہ بیان کرتا ہے۔ "سامان، مال اور ملازمتوں کی تقسیم کی بنیاد انسان و انسانیت کے متعلق صحیح نظریہ پر رکھنی چاہیئے۔ اس کی تہ میں انسان کی قدر و قیمت ہونی چاہیئے"۔ اگر ہمارے اقتصادی نظام کی بنیاد انسان کی قدر و قیمت پر رکھی جاتی۔ تو ہر انسان کو بڑی آسانی سے کام مہیا کیا

جا سکتا۔ کام کا معاوضہ بھی انسانی ضروریات و فرائض کے مطابق دیا جا سکتا۔ اور انسان کو غیر اقتصادی کاموں کے لئے کافی فرصت کا وقت بھی مہیا کیا جا سکتا۔

ہاں! انسان کے متعلق صحیح نظریہ کے معنے یہ ہیں۔ کہ ایک انسان کو دوسرے کا غلام نہ بنایا جائے۔ اور کہ ایک انسان اپنے منافع کی خاطر دوسروں کو لوٹ گھسوٹ نہ سکے۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ جب تک کہ سوسائٹی کا سارا نظام دستکاری Hand labour پر تعمیر نہ کیا جائے۔ جس میں ایک انسان کو باعزت گذارہ مہیا ہو سکے اور اُسے اتنا کام کرنا پڑے۔ جتنا وہ آسانی سے سرانجام دے سکتا ہو۔

ایڈورڈ کارپنٹیر نے فی الواقعی ہماری بیماری کی صحیح نبض پر انگلی رکھی جب اس نے کہا۔

"دوسروں کی مزدوری پر زندہ رہنے کے طریقہ کو قطعاً بند کر دینا چاہئے۔ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں۔ یہی بات مابین افراد و مابین اقوام ابتدائے آفرینش سے جنگ کا موجب بنتی چلی آئی ہے اور اب بھی ہے۔"

اب ہم اعتراض کے دوسرے جزو یعنی عدم تشدد نے کسی غیر ملکی کو اپیل نہیں نہیں کیا۔ اس کے جواب میں ہم ذیل میں ایک چٹھی Mr Richard Gragg (مسٹر رچرڈ گریگ) ایک امریکن کی جو انہوں نے مہاتما گاندھی جی کو لکھی جسے مہاتما جی نے ہریجن مورخہ ۲۲ ۶/۲ کے پرچہ میں شائع کیا۔ نقل کرتے ہیں:۔

جب سے میں نے آپ کو پچھلا خط لکھا۔ اس کے بعد کے ان مہینوں میں عدم تشدد کے ضابطہ کی پابندیوں اور دوسروں کو پر امن طور پر اس کے قائل کرنے کے مسائل سے میں دماغی طور پر کشتی لڑتا رہا ہوں اور مجھے یہی فکر دامن گیر رہی ہے۔ کہ عدم تشدد کو اور اس کے بتلائے ہوئے حل کو مغربی الفاظ میں کس طرح بیان کروں۔ جیسا کہ میرا خیال ہے میں آپ کو پہلے بھی تحریر کر چکا ہوں۔ کہ میں ستیا گرہ کے انہی ہر دو پہلوؤں پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں تاکہ میری اہنسا کی طاقت میں اس سے امداد حاصل ہو۔ میں پڑھتا ہوں اور غور کرتا ہوں دوبارہ پڑھتا ہوں اور غور کرتا ہوں۔ گذشتہ چند ہفتوں میں میں نے ایک ڈھانچے کا تصور باندھا ہے۔ جس میں سارے معاملہ پر پہلے سے بہت زیادہ صفائی کے ساتھ روشنی پڑتی ہے۔ میں اس بات میں کوشاں ہوں۔ کہ مغربی دنیا کو آپ کے پروگرام کی درستگی اور اس کے قابلِ عمل ہونے کا احساس کرا دوں۔

مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ کہ آپ نے گذشتہ ماہ میں اس قدر مضبوطی سے اس امر پر زور دیا ہے۔ کہ جب تک کانگرس سرگرمی سے اور وفاداری سے کھادی کے پروگرام پر عمل پیرا نہ ہو جائے۔ تب تک آپ گورنمنٹ کے خلاف کسی کھلے ستیاگرہ میں اس کی رہنمائی نہ کریں گے۔ میرے نزدیک اس چیز کی ضرورت آفتاب کی مانند آشکارا ہے۔ آپ ایسا کرنے میں بالکل راستی پر ہیں۔

معاملہ کے اس پہلو کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ موجودہ جنگ کے خاتمہ پر تمام یورپ کو آپ کے کھادی پروگرام اور آپ کی اس تعلیمی تجویز کی جس میں کتابوں کے بغیر دستکاری کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ سخت ضرورت لاحق ہوگی کیونکہ انگلستان اور Continent (یورپ) کے متوسط درجہ کے لوگ کنگال ہو جائیں گے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا بھی یہی حال ہوگا۔ اور اتنی ہی شدت سے ہوگا۔ جتنی شدت سے یورپ کا ہوگا۔ کیونکہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ سنہ ۱۹۲۹-۳۴ء میں جو اقتصادی بدحالی واقع ہوئی تھی۔ وہ ہمارے ہاں بھی ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ یورپ میں واقع ہوئی۔ جو تجربہ اور کام کرنے کے ٹیکنیکل طریقے ہندوستان کی کھادی کی تحریک جمع کرے گی۔ وہ جنگ کے بعد کے زمانہ میں بڑے قیمتی اور مفید ثابت ہوں گے۔

باوجود جنگ کی دہشت کے میں عدم تشدد کے مستقبل کے متعلق پر امید ہوں۔ دنیا کی تاریخ میں عدم تشدد میں یقین رکھنے والوں کی اتنی کثرت کبھی پہلے دیکھنے میں نہیں آئی۔ کیا بلحاظ اس کی تعداد کے اور کیا بلحاظ اوسط آبادی کے۔ اس سے پیشتر یہ یقین ہر گروہ، ہر جماعت اور ہر مذہب اور ہر پیشہ میں کبھی نمودار نہ تھا۔ اس سے پیشتر کبھی بھی اس قدر کثیر التعداد بڑے بڑے مدبروں نے اتنی سرگرمی وضاحت اور علی الاعلان طور پر جنگ و تشدد کی بیہودگی

کے تاثرات اور تباہ کاری کی مذمت نہیں کی تھی۔ اس سے پیشتر کبھی بھی اس قدر تعداد میں فوجی ماہر اپنے طریقوں کی جوازیت اور نتیجہ خیزی کے متعلق اتنے مایوس نہیں ہوئے تھے۔ گذشتہ پورے دو سالوں میں اور جب سے جنگ کا آغاز ہوا ہے۔ اور تیزی سے برطانیہ اور امریکہ کی مضبوط پر امن تحریکیں خوب ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ وہ کبھی بھی اتنی بڑی نہ تھیں۔ یہ صرف جذباتی چیز ہی نہیں رہی۔ بلکہ اس مسئلہ کے ہر پہلو کے متعلق بڑے غور و خوض سے سرگرمانہ تحقیق و تجسس جاری ہے۔

۹ / مارچ ۱۹۴۰ء تک برطانیہ عظمہ کے ان فوجی رنگروٹوں کی تعداد ۲۶،۶۸۱ ہے۔ جنہوں نے سرکاری رجسٹروں میں اپنا نام بطور "معترضین جنگ" Conscientious Objectors (جنگ کو خلاف ضمیر سمجھنے والے) درج کرایا ہے۔ حالانکہ ۱۹۱۴ء-۱۸ء کے چار سالوں میں ایسے معترضین کی تعداد کل ۱۶،۰۰۰ تھی۔ اگرچہ پیشین گوئی کرنا یقینی چیز نہیں ہوتی۔ تاہم سارے واقعات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں۔ کہ اگر ریاست ہائے متحدہ کو بھی جنگ میں شامل ہونا پڑا۔ تو معترضین کی تعداد یہاں بھی اسی قدر زیادہ ہو جائے گی۔ انگلستان کی جبریہ بھرتی کی چھ قسطوں میں جو جون سال گذشتہ و مارچ سال حال کے درمیان کی گئی۔ معترضین کی تعداد ۱۶۶ سے ۲۰۵ فیصدی تک پہنچ گئی یہ تعداد اور بھی دلچسپ معلوم دیتی ہے۔ جب اس کا میدان اس

اندازہ سے کیا جائے۔ کہ تمام ممالک میں حقیقتاً لوگوں کی وہ تعداد جو گورنمنٹ کے کام کرنے میں سرگرم رہتی ہے۔ آبادی کا فیصدی ۲ سے زائد نہیں ہوتی۔

۱۹۱۴-۱۸ء کی جنگ کے بعد وہ Pacifist (حامی امن) جنہیں جنگ کے دوران میں بہت تنگ کیا گیا تھا سب مسلمہ لیڈر بن گئے تھے۔ یہی بات اغلباً اب کے بھی ہو گی۔

گذشتہ عالمگیر جنگ کے بعد تمام اقوام میں جنہوں نے جنگ میں حصہ لیا یا نہ لیا۔ ایک زبردست (حامی امن) Pacifist تحریک پھیلی۔ ایسا ہی دوبارہ ہونا اغلب ہے۔ پہلی جنگ کے دوران میں وہ تحریک زیادہ تر جذباتی حیثیت رکھتی تھی۔ جب اس کی آزمائش کی گئی۔ تو ٹوٹ گئی۔ لیکن اس وقت کے بعد بہت کچھ غور و خوض ہوا ہے۔ اور اب عدم تشدد میں یقین رکھنے والے اپنے مسائل کو بخوبی سمجھنے لگے ہیں۔ وہ اپنی مشکلات اور ان کے حل کے طریقوں کو پہلے کی نسبت بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ مستقبل میں وہ زیادہ موثر ثابت ہوں گے۔

موجودہ جنگ کے بعد باہمی نفرت اور خوف گذشتہ عالمگیر جنگ کی نسبت زیادہ گہرے اور مضبوط ہوں گے۔ لیکن اپنی اپنی قوم کی گذشتہ غلطیوں اور قصوروں کو جاننے اور ماننے کے لئے زیادہ ایمانداری اور رضامندی دکھائی دے گی۔ اور پورا نے

عادات و تجربات کو نئے طریقوں سے تبدیل کرنے کی زیادہ آمادگی پائی جائے گی۔

اوپر کی چھٹی کے اختتام پر مہاتما گاندھی جی لکھتے ہیں:۔

مسٹر گریگ بڑا احتیاط بچار کرنے والا ہے۔ وہ کسی چیز کو فرض نہیں کر لیتا۔ اس کی چھٹی کا آخری پیراگراف اس کے عملی پہلو پر روشنی ڈالتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں۔ کہ منطقانہ غور و خوض کی کوئی مقدار بھی دنیا میں عدم تشدد کی فوقیت کو قائم نہیں کر سکتی۔ ایک چیز ہے جو اس کی فوقیت کو قائم کر سکتی ہے۔ اور وہ ہے ہندوستان کی قابلیت جس سے کہ ہندوستان عدم تشدد کے عملی استعمال سے اپنی قومی آزادی کو حاصل کر کے اور قائم رکھ کے اس کی فوقیت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

اب ہم اعتراض کے دوسرے جزو کے آخری حصہ یعنی حملہ آور کا مقابلہ عدم تشدد کے ذریعہ ناقابل فہم ہے کا جواب عرض کرتے ہیں پیشتر ازیں مہاتما گاندھی اور لارڈ لنلتھگو کی باہمی گفتگو کا ماحصل ایک مکالمہ کی صورت میں انہی صفحات میں درج کر چکے ہیں۔ اس میں اس اعتراض کا جواب بخوبی آچکا ہے مہاتما گاندھی جی کے مضمون بعنوان "ہٹلر ازم کا مقابلہ کیسے کیا جائے" جو ہریجن مورخہ ۱۹۴۰/۶/۱۶ میں شائع ہوا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کرتا ہے یہ تو سچ ہے کہ یہ جواب کوئی امر واقعہ کی شہادت پیش نہیں کرتا لیکن مہاتما گاندھی جی جو موجودہ جگ میں اس اعتراض کا جواب دینے کیلئے موزوں ترین دنیا بھر میں ایک ہی شخصیت ہیں۔ ان کے ہی خیالات کو پیش کرتے ہیں:۔

ہٹلرازم سے مقابلہ کیسے کیا جائے

مہاتما گاندھی

ہٹلرازم آخر کار کیا ثابت ہوگا۔ اس کو نظر انداز کر کے ہٹلرازم کے ظاہرہ معنے ہماری سمجھ میں آچکے ہیں اس کے معنے ہیں ننگ دھڑنگ جبری قوت جس نے سائنٹیفک شکل اختیار کر لی ہے۔ اور جو سائنٹیفک طریقوں سے عمل میں لائی جاتی ہے۔ اثر کے لحاظ سے یہ اتنی زبردست ہے کہ اس کا مقابلہ ناممکن ہے۔

ستیاگرہ کے ابتدائی ایام میں جبکہ اس کو خاموش مقابلہ کا نام دیا جاتا تھا۔ جوہنزبرگ (جنوبی افریقہ) کے اخبار "سٹار" نے ایک واقعہ کا بیان کیا۔ اس نے نہتے ہندوستانیوں کے ایک گروہ کو جو اگر ہتھیار استعمال کرنا بھی چاہتا۔ تو استعمال کرنے کی قوت نہ رکھتا تھا۔ ایک نہایت ہی زبردست ہتھیار بند گورنمنٹ کے مقابلہ میں ڈٹے ہوئے دیکھا تھا اور اس نظارہ کا اس نے کارٹون بنایا۔ اس نے گورنمنٹ کو ایک ایسے سٹیم رولر سے تشبیہ دی۔ جس کے آگے کسی چیز کا اڑنا محال ہو۔ اور خاموش مقابلہ کرنے والوں کو ایک ہاتھی سے تشبیہ دی جو نہایت آرام سے سٹیم رولر کے راستہ میں اپنی جگہ پر ڈٹا بیٹھا ہے۔ اور ہلنے کا نام نہیں لیتا۔ کارٹون بنانے والے نے نہایت غور سے ان دونوں طاقتوں کو صحیح تشبیہ سے ظاہر کیا۔ ایک اس قدر زبردست جس کے آگے کسی چیز کا ٹھہرنا محال ہو۔ دوسری اتنی بے فکر کہ اس کے راستہ سے

ہلنے کا نام نہیں لینی۔ اس وقت تو یہ ایک قسم کا روکاوٹ کا معاملہ تھا۔ مگر بعد میں جو نتیجہ نکلا۔ وہ ہمارے سامنے ہے۔ جس قوت کو اس وقت ناقابل مقابلہ بیان کیا گیا۔ اس کو نہ ہلنے والی ستیاگرہ کی طاقت نے نہایت کامیابی سے پچھاڑ دیا۔ آپ اس طاقت کو بغیر جواب دینے کے برداشت کی طاقت کا نام بھی دے سکتے ہیں۔

جو اس وقت صحیح ثابت ہوا وہی اب بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ ہٹلرازم کا مقابلہ ہٹلرازم سے کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ تو یہ ہو گا۔ کہ ایک اور زبردست ہٹلرازم پیدا ہو گی جس کا پارہ تشدد کے ۱۰۹ درجہ پر پہنچا ہو۔ جو کچھ آج ہماری آنکھوں کے سامنے پیش آ رہا ہے۔ وہ تشدد اور ہٹلرازم کی بیہودگی کا پورا نظارہ ہے۔

ہٹلرازم کی ناکامی سے میری کیا مراد ہے۔ اس کو واضح کرتا ہوں۔ اس نے چھوٹی قوموں کی آزادی چھین لی ہے۔ اس نے فرانس کو بھی مجبور کیا ہے۔ کہ وہ صلح کی درخواست کرے۔ جب یہ پرچہ ناظرین کے ہاتھ میں پہنچے گا۔ تب تک اغلباً برطانیہ نے اپنے راستہ کا فیصلہ کر لیا ہو گا میری دلیل کے لئے فرانس کی مثال ہی کافی ہے۔ میرا خیال ہے کہ فرانسیسی مدبروں نے بے نظیر دلیری کا ثبوت دیا ہے۔ جب کہ وہ ہونہار کے سامنے جھک گئے ہیں۔ اور بے فائدہ باہمی کشت و خون میں مزید حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ فرانس کی جنگ سے فتح مند ہو کر نکلنے کے کیا معنے ہوتے۔ اگر وہ ہی تباہ ہو جاتے جس کی خاطر جنگ کرنا مقصود

تھا۔ وہ آزادی بالکل ایک مخول بن جاتی ہے۔ جس کی قیمت ان لوگوں کی مکمل تباہی سے ادا کرنی پڑے۔ جنہوں نے اس آزادی سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ تو اس صورت میں صرف ایک جذبہ کی ناپاک مسیری رہ جاتی ہے فرانسیسی سپاہیوں کی بہادری تمام دنیا میں مشہور رہی ہے۔ لیکن اب دنیا فرانسیسی مدبروں کی اس سے بھی زیادہ بہادری کا مظاہرہ کرے گی۔ جو انہوں نے امن کی درخواست کر کے ظاہر کی ہے۔ میں نے یہ فرض کر لیا ہے۔ کہ فرانسیسی مدبروں نے یہ ایک بالکل معززانہ اقدام کیا ہے جیسا کہ سچے سپاہیوں کی شان کے شایان ہے۔ مجھے امید ہے۔ کہ ہر ہٹلر بھی کوئی ذلیل کن شرائط ان کے سامنے پیش نہ کرے گا۔ بلکہ یہ ثابت کر دے گا۔ کہ گو وہ جنگ کرنے میں بالکل بے رحم ہے۔ وہ کم از کم صلح کرنے میں بالکل بے رحم نہیں ہے۔

اب پھر میں اپنی دلیل کی طرف آتا ہوں۔ ہٹلر فتح حاصل کر کے کیا کریگا؟ کیا وہ اس قدر طاقت ہضم کر سکے گا۔ ذاتی طور پر وہ بھی اسی طرح خالی ہاتھ اس دنیا سے رخصت ہو گا۔ جیسا کہ اس کا پیشرو سکندر اعظم جو بہت پرانا پیشرو نہیں۔ جرمنوں کے لئے وہ ایک عظیم سلطنت رکھنے کے مالک ہونے کی خوشی ورثہ میں نہیں چھوڑ جائے گا۔ بلکہ اس کے کچل ڈالنے والے بوجھ کو ان کے کندھوں پر ڈال جائے گا۔ کیونکہ وہ دائمی طور پر تمام مفتوحہ ممالک کو غلام بنائے رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے اور مجھے اس میں شک ہے۔ کہ آئندہ آنے والی جرمن نسلیں بلا دریغ

ہٹلرازم سے پیدا شدہ تمام واقعات پر فخر کر سکیں۔ وہ ہٹلر کی عزت کریں گے۔ کہ وہ ایک ذہین۔ ایک بہادر۔ ایک لاثانی منتظم اور اس سے بھی بڑھ کر انسان تھا۔ لیکن میں امید رکھتا ہوں۔ کہ آئندہ آنے والے جرمن بھی اپنے بہادروں کے متعلق بھی تمیز کرنا سیکھ لیں گے۔ خواہ کچھ ہو۔ میرا خیال ہے۔ کہ اتنا تو ہر ایک تسلیم کرے گا۔ کہ ہٹلر کے اس خون وخرابہ نے دنیا کے اخلاقی قدروقامت کو ایک انچ کے دس لاکھواں حصہ کے برابر بھی نہیں بڑھایا۔

اس کے مقابلہ پر ذرا آج کی یوریپین حالت کا اس وقت کا تصور باندھیئے۔ جب کہ زیک۔ پول۔ ناروے کے لوگ۔ فرانسیسی اور انگریز ہٹلر سے یوں مخاطب ہوتے ہ۔

"تمہیں تباہی کے لئے کسی سائنٹیفک تیاری کی ضرورت۔۔ نہیں ہم تمہارے تشدد کا عدم تشدد سے سامنا کریں گے۔ تم ہماری عدم تشدد کی فوجوں کو بغیر ٹینکوں۔ جنگی جہازوں اور ہوائی جہازوں کے ہی تباہ کر سکتے ہو۔"

جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا۔ کہ ہٹلر نے اس وقت جو کچھ خونی جنگ کر کے حاصل کیا۔ وہ بغیر جنگ کے حاصل کر لیتا۔ یہ ٹھیک ہے۔ مگر یورپ کی تاریخ اس وقت بالکل مختلف طور پر لکھی جاتی۔ قبضہ شاید (لیکن شاید) اس وقت خاموش مقابلہ کی حالت میں حاصل ہوتا۔ جیسا کہ اب ناقابل بیان مظالم توڑنے کے بعد حاصل

کیا گیا ہے۔ عدم تشدد کی حالت میں صرف وہی مارے جاتے جنہوں نے اپنے آپ کو بشرط ضرورت قربان کرنے کی تربیت حاصل کی ہوئی ہوتی۔ اور جو مقابلہ میں نہ کسی کو مارتے۔ بلکہ کسی سے نفرت تک بھی دل میں نہ رکھتے۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ کہ ایسی حالت میں یورپ کے اخلاقی قدو قامت میں کئی انچ کا اضافہ ہو جاتا۔ اور میں امید کرتا ہوں۔ کہ آخر کار اخلاق ہی ہے۔ جس کی قدر ہوتی ہے باقی سب کچھ ہیچ ہے۔

میں نے یہ سطور یورپین طاقتوں کو مخاطب کر کے لکھی ہیں۔ لیکن یہ ہمارے لئے بھی ہیں۔ اگر میری دلیل سمجھ میں آگئی ہے۔ تو کیا ہمارے لئے یہ موزوں وقت نہیں ہے۔ کہ ہم بہادرانہ عدم تشدد میں اپنے یقین کا اعلان کر دیں۔ اور صاف کہہ دیں۔ کہ ہم اپنی آزادی کی حفاظت ہتھیار بند طریقوں سے نہیں کریں گے۔ بلکہ ہم اس کی حفاظت عدم تشددانہ طریقوں سے کریں گے؟

ایک تاریخی ثبوت

اس امر کے ثبوت میں کہ دنیا کی تاریخ میں اس سے پیشتر بھی "عدم تشدد" کے ذریعہ سیاسی مسائل کا حل کیا جا چکا ہے۔ میں ذیل میں تازہ ہری جن مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۴۰ء کی اشاعت میں شائع شدہ ایک مضمون جو مسٹر Ralph T. Templin کی قلم سے ہے۔ ناظرین کے مطالعہ

کے لیے پیش کرتا ہوں:-

کھلی چٹھی

از متھرا۔ انڈیا۔ جولائی ۱۷ ۱۹۴۰ء

مائی ڈیر گاندھی جی

گذشتہ مہینوں پُرامید انتظار کے بعد میرے مشنری بورڈ نے ذیل کا بحری تار بھیجا ہے۔

Your missionery effectiveness seriously impaired making necessary with regret immediate recall.

(آپ کی مشنری تاثیر سخت کمزور ہو چکی ہے۔ لہذا نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو واپس بلانا لازمی سمجھا گیا ہے)

میں پہلے ہی آپ کو نئی Stand کے متعلق کچھ لکھنے پر غور کر رہا تھا۔ لیکن اب جبکہ ہمارے اس حقیر حصہ کا جو ہم "بے ہتھیار کے جنگ" میں لینا چاہتے تھے۔ میدان عمل ہندوستان سے امریکہ کو تبدیل ہونے کو ہے۔ مجھے آپ کو لکھنے کا شوق پہلے سے زیادہ شدت سے بڑھ گیا ہے۔ ہم اس کو اسی طرح سمجھتے ہیں۔ کہ خدا نے ایک دروازہ بند کرکے دوسرا کھول دیا ہے۔ ہم اپنے کام کے اثر کے متعلق خواہ وہ یہاں پر ہو یا وہاں پر۔ اسی کے حکم پر بھروسہ رکھنے پر قانع ہیں۔ موجودہ دنیا ایسے اثر کی جانچ کرنے کی رغبت نہیں رکھتی۔

As the great Lowell expressed:-

"We see dimly in the Present what is small and what is great.

Slow of faith how weak an arm may turn the iron helm of fate"

میں ابھی تک پُرامید ہوں اور روزانہ دعا کرتا ہوں۔ کہ کانگرس یہ محسوس کرے۔ کہ اس کے لئے سب سے بہترین موقع اس وقت اپنے دشمن پر مشکوک سیاسی فتح حاصل کرنے کا نہیں۔ بلکہ ایسے نادر موقع پر۔ اُن سب لوگوں کے ساتھ جو آزادی سے محبت رکھتے ہیں خواہ وہ انگلینڈ میں ہوں یا دنیا کے کسی دیگر حصہ میں۔ اُسے دوستی پیدا کرنی چاہیئے۔ اس مدعا کے ساتھ کہ وہ ہندوستان کی یا جمہوریت کی حفاظت کر سکے۔ یعنی کہ انسان کے ساتھ غیر انسانی سلوک روا رکھنے والے دنیا بھر کے سارے نظام کے خلاف ایک شانت سے فیصلہ کن جنگ کا چھیڑنا۔ ہندوستان کی وہ متحدہ طاقت جو ایک تھرڈ کلاس فوج تیار کر سکتی ہے۔ وہ تو زیادہ سے زیادہ طاقت کے متوالے۔ قابل نفرین کمال کو پہنچے ہوئے۔ بین الاقوامی غنڈوں کی طاقت کے سامنے ایک کھلونے سے بڑھ کر حیثیت نہیں رکھ سکتی۔ لیکن ڈیفنس کمیٹی ہائے جو اس سے زیادہ کچھ علم نہیں رکھتیں۔ ان کی بھی دل شکنی نہیں کرنی چاہیئے میرا مدعا یہ ہے۔ کہ جو لوگ پُرامن طریقہ کے حامی ہیں۔ اور ایسے سمجھتے

ہیں۔ وہ اپنی ایک شانت مئی حفاظتی فوج تیار کر لیں۔ بالکل اسی مقصد کے لئے کہ جس کے لئے ہتھیار بند فوج تیار کی جا رہی ہے۔ ہتھیار بند فوج کی مانند اس فوج میں بھی غیر سیاسی اور رضا مندانہ طریقوں سے بھرتی ہونی چاہیے۔ اور بجائے اس کے کہ یہ فوج ایک منفی طریقہ پر ہندوستان کی حفاظت کے لئے بے ضرر ثابت ہو۔ وہ آغاز سے ہی اپنی خدمات گورنمنٹ کو پیش کرے۔ اور اُسے برملا کہہ دے کہ انہیں ہندوستان میں یا اس سے باہر جہاں کہیں بھی گورنمنٹ چاہیے آزادی کے دشمنوں کے خلاف استعمال میں لا سکتی ہے۔ اس طرح یہ ہندوستان کی ایک شانت مئی (پر امن) فوج ہو گی۔ اس امر کی بہت بڑی امید ہے۔ کہ یہ فوج براہ راست اور بہت جلد دنیا بھر کی ایک پُر امن فوج کے قیام میں رہنمائی کرے گی۔ میرا پختہ یقین ہے۔ کہ ہر ملک میں سینکڑوں آدمی اس قسم کی فوج کے جھنڈے تلے جمع ہونے کو تیار بیٹھے ہیں حکومتیں بھی جلدی ہی ایک ایسی فوج پر اعتماد رکھنے پر راغب ہو جائیں گی۔ جس نے پہلے ہی بہت سے طریقوں سے اپنے آپ کو ناقابل شکست ثابت کر دیا ہو۔ اس چیز کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے۔ کہ موجودہ جنگ نے اتنا تو ثابت کر ہی دیا ہے۔ کہ ہتھیار بند قوت جمہوری نظام کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ وہ اُسے توڑ پھوڑ کر تباہ نہ کر لے۔ علاوہ ازیں آج دنیا کی سب سے

بڑی حفاظتی فوج بھی اپنی قوم کو دنیا کے جنگجو پاگلوں کے ہاتھوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ میرا یقین ہے۔ کہ شانتی سینی جنگ تمام حملوں سے بچاؤ کے لئے خواہ وہ اقتصادی ہو یا سیاسی۔ نہ صرف سب قسم کی فوجوں سے زیادہ مؤثر ثابت ہوگی۔ بلکہ بہت جلد تیار بھی کی جاسکیگی۔ بشرطیکہ دنیا بھر کے امن پسند لوگ اس معاملہ پر اپنا دل و دماغ مرکوز کر دیں۔ اس بات کی پرواہ نہیں۔ کہ ان کی تعداد تھوڑی ہوگی۔ سب سے پہلا قدم یہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہم وائسرائے کے پاس پہنچ کر اس کی آشیرباد (God speed) اس تحریک کے لئے حاصل کریں۔ آپ یقین جانئے یہ بہت جلد حاصل بھی ہو جائے گی۔

اس کے سوا کیا اور کوئی ایسا چارہ کار ہے؟ جس سے تہذیب کے قیمتی خزانے محفوظ رکھے جاسکیں؟ فوجی طاقت جمہوریت کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ کیونکہ تشدد خواہ وہ اعلانیہ نہ بھی ہو۔ ایک ایسا طریقہ ہے۔ جو جمہوریت کے لئے زہر قاتل ... ہے۔ اور اگر یہ ظاہراً برتا جائے۔ تو جمہوریت کی موت کا عمل بہت جلد واقع ہو جاتا ہے۔ چونکہ مغربی سوسائٹی کی تنظیم عملی طور پر تشدد کی بنا پر کی گئی ہے۔ وہاں نہ صرف جنگ کا ہونا ناگزیر ہے۔ بلکہ موجودہ جنگ کے آغاز سے پیشتر ہی وہاں جمہوریت ایک ڈھول کا پول بن کر رہ گئی ہے۔ پر تشدد نظام سوسائٹی اور جمہوریت یہ دو متضاد چیزیں ہیں۔

ہم ایک ہی وقت میں اپنی آزادی اور عیش و آرام و مراعات کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ آزادی کی حفاظت کے لازمی طور پر یہ معنے ہوتے ہیں۔ کہ ہم دوسروں پر فوقیت کے تمام حقوق ترک کریں۔ جب تک ہم ایسا نہ کریں۔ ہم یہ دعوےٰ نہیں کر سکتے۔ کہ ہماری جدوجہد صادقانہ ہے۔

رسمی جمہوریت ظاہراً ان لوگوں کو جن کے خیالات کی نمائندگی حکومت میں نہیں ہوتی۔ ہتھیار بند بغاوت کا حق دیتی ہے۔ لیکن خالص یا حقیقی جمہوریت کو تشدد کو اڑا کر پرامن بغاوت کا حق قائم رکھنا ہوگا۔ جس کی وجہ یہ ہے۔ کہ تشدد خواہ کسی طریقہ پر استعمال کیا جائے، وہ جمہوریت کا رد ہوتا ہے۔ اور تشدد استعمال نہیں ہوسکتا جب تک عارضی طور پر جمہوریت کا انہدام عمل میں نہ لایا جائے۔ بخلاف اس کے۔ جمہوریت کے دشمنوں کا مقابلہ شانت مئی طریقوں سے کرنے سے باہمی اعتماد کی جمہوری سپرٹ دوست اور دشمن دونوں میں یکساں طور پر آزاد رہتی ہے۔ یہ بات ہندوستان کی اس پُرامن جنگ میں جو ہندوستان کی قومی آزادی کی تحریک میں شروع کی جاتی رہی ہے۔ بار بار پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں غلاموں کی تجارت کی تنسیخ جب تک عدم تشدد کے طریقہ پر چلائی گئی۔ جیسا کہ ۱۸۳۰ء سے ۱۸۴۲ء تک ایک بڑے سنت Theodore Dwight کی رہنمائی

میں کیا گیا۔ تب تک جنوبی ریاستوں کے غلام رکھنے والوں میں کثرت سے خیالات میں تبدیلی واقع ہوتی رہی۔ مزید براں یہ جاننا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ کہ پہلی تیرہ نو آبادیوں کی آزادی اور حبشیوں کی آزادی دونوں ہی جنگ سے حاصل نہ ہوئی تھیں۔ بغاوتی جنگ سے تو صرف تعلقات ہی منقطع ہوتے تھے۔

بعد ازاں ۲۵ برس کا ایسا بُرا زمانہ آیا۔ جو غلامی سے بھی بدتر تھا۔ اور جس میں سرحدی کشت وخون کا میدان گرم رہا۔ آزادی کا راستہ تو ایک پُر امن آئینی ترقی کا راستہ تھا۔ جو کہ جنگ کے طریقہ سے بالکل برعکس تھا۔ جنگ سے تو صرف پریشانی۔ فساد اور گڑبڑ پیدا ہوئی۔ اس جنگ کے متعلق یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی ایسا طریقہ بھی ہو سکتا تھا۔ کہ جس سے علیحدگی کا مقصد بغیر ۲۵ سالہ خونی جدوجہد کے کسی اچھے طریقہ پر حاصل ہو سکتا؟ یہ یقین ہے۔ کہ ایسا طریقہ ہے۔ اور یہ مقصد بھی حاصل ہو سکتا تھا اگر اس وقت اس طریقہ کا علم ہوتا۔ امریکن حبشی کی حالت تو یہ ہے۔ کہ وہ اب تک بھی آزاد نہیں۔ وہ آزادی جو اس وقت تک اُسے حاصل ہوئی۔ وہ خانہ جنگی کے بعد حاصل ہوئی۔ اس وقت حاصل ہوئی جب کہ عدم تشدد کے جذبات نے شمالی اور جنوبی لوگوں کے دلوں میں بھرے ہوئے پُر تشدد جذبات پر غلبہ پا لیا۔ اسی عدم تشدد کے جذبہ کو سب سے بڑے تشدد کے اس جذبہ کا سامنا کرنا پڑا۔ جو ایک طرف تو جنگ

میں شکست کھانے کی وجہ سے پیدا ہوُا تھا۔ اور دوسری طرف بدلہ لینے کے جذبہ کے طور پر موجزن ہو رہا تھا۔ یہ تشدد کا جذبہ اس قدر بھیانک روپ اختیار کر چکا تھا۔ کہ اس کی وجہ سے ایک بزرگ ہستی Lincoln کو موت کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ وہ صلح اور آشتی کے حق میں تھا۔ میرا خیال ہے۔ کہ تاریخ میں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی۔ جب کہ کسی حفاظتی جنگ نے ان مسائل کا حل کر دیا ہو۔ کہ جن کی خاطر حفاظت کنندگان نے وہ جنگ چھیڑی تھی لیکن اُس کے مقابلہ میں ڈنمارک کی مثال موجودہ جنگ میں ایسی ہے۔ کہ ایک قوم نے جان بوجھ کر سلطنت پرستی کی فتوحات اور موجودہ حالت کو برقرار رکھنے کے لئے حفاظتی جنگ کی فرضی شان کے خیال کو ایک طرف رکھ کر آزادی کے راستہ پر گامزن ہونے کی شاندار مثال قائم کر دی ہے۔ (مہاتما گاندھی جی نے اپنے فٹ نوٹ میں اس خیال کی تردید کر دی ہے۔ کہ ڈنمارک نے عدم تشدد کے طریقوں پر عمل کیا ہے۔ ہاں اتنا ضرور کیا ہے۔ کہ مفت کے خون و خرابہ سے نکلنے کے لئے ایک اچھا وطیرہ اختیار کیا ہے) کرشٹا گرہا (Krista graha) نے پہلے ہی اپنے دو مینی فیسٹوں میں اپنے خداوند یسوع مسیح کی اہنسا آتمک نیتی پر عمل کرنے کا کھلا اعلان کر دیا ہے۔ بہت سے مشنریوں کو ایک

میمورنیڈم بھیجا گیا ہے۔ یہ میمورنیڈم A ہے۔ جس کے ماتحت تمام غیر برطانوی مشنریوں کو کام کرنا ہوتا ہے۔ اس میں ایک نوٹ ہے۔ جس کو پڑھ کر بہت سے حیران ہوئے ہیں۔ اس میں درج ہے۔ کہ گورنمنٹ نے ان کے لئے یہ بھی شرط لگائی ہے۔ کہ وہ لوگ سیاسیات پر بھی ایسا اثر ڈالیں۔ جس سے کہ اُن کے اپنے ملک وقوم کی بہتری و حفاظت ہو سکے۔ میرے خیال میں یہ بات عام عیسائیوں کے لئے خواہ وہ مشنری ہوں یا غیر ایک اہم موقع مہیا کرتی ہے۔ کہ وہ اپنے ملک اور دنیا کی خدمت بھی کریں۔ اور اپنے خداوند کے اس حکم کی تعمیل کریں "ہمیں تلوار نہ پکڑنی چاہیئے"۔ میں اپنے متعلق تو یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں۔ کہ میں اس عظیم کام کے لئے بالکل تیار ہوں۔ اور اگر آپ دنیا میں ایک ستیاگرہیوں کی پُرامن فوج تیار کرنے کی۔ ذمہ داری لیں تو میں اپنا نام بطور سپاہی پیش کرتا ہوں۔ میں خیال کرتا ہوں۔ کہ فقط یہ ہی ایک طریقہ ہے۔ جس پر چل کر جبر و تشدد کے جذبات جو انسانی برادری کے دلوں میں جاگزیں ہو چکے ہیں۔ جڑ سے اکھڑ سکتے ہیں۔ اور دنیا کی سوسائٹی کا نظام دوبارہ۔ انصاف۔ مساوات اور امن کی بنا کر قائم کیا جا سکتا ہے۔

Ralph T. Templin

باب سوم

سوالات وجوابات

مہاتما گاندھی جی موجودہ زمانہ میں ایک ایسی شخصیت بن چکے ہیں۔ جنہیں دنیا میں راستی اور عدم تشدد کا واحد مجسمہ خیال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے انڈین نیشنل کانگرس کو گذشتہ بیس سالوں سے سیاسی میدان میں انہی اصولوں کے ماتحت جدوجہد آزادی کی مشق کرائی ہے۔ آج اہنسا اور ستیہ کے اصولوں نے ساری دنیا کی توجہ کو اپنی طرف کھینچ رکھا ہے۔ ان کے متعلق ہر مذہب و ملت کے رہبر و پیروکار مہاتما جی سے کئی ایک سوالات کرتے رہتے ہیں۔ انہیں سے چیدہ چیدہ سوالات کے جوابات جو مہاتما جی کی قلم سے نکلے ہوئے ہیں۔ جوں کے توں ناظرین کے پیش کئے جاتے

ہیں۔ اُن سے ناظرین کے اپنے دل میں مذہبی، مجلسی اور سیاسی و ادبی اخلاقی اور اقتصادی نکتہ خیال سے پیدا ہونے والے کئی ایک شک و شبہات کا بھی ازالہ ہو جائے گا۔ کسی کو ستیاگرہی بننا ہو۔ کسی کو قومی تحریک آزادی سے محبت ہو۔ کوئی علمی مذاق رکھنے والا ہو۔ سب کو کافی واقفیت ان سوال و جوابوں میں سے حاصل ہو سکتی ہے۔

بُرے طریقہ پر کمایا ہوا روپیہ

سوال:۔ فرض کیجئے کہ ایک آدمی نے غریبوں کا خون چوس کر کروڑوں روپیہ اکٹھا کر کے آپ جیسے مہاتما کو دے دیا۔ اور آپ نے وہ روپیہ اچھے نیک کام میں خرچ کر دیا۔ اس سے کیا وہ کروڑوں روپیہ اکٹھا کرنے والا آدمی پاپ سے چھوٹ گیا؟ بُری کمائی کا روپیہ لے کر آپ نے نیتی کو توڑا نہیں ہے؟ جہاں اس قسم کی کارروائیاں زیر عمل ہوں۔ وہاں کے اشخاص بھلا کیسے پاک و صاف رہ سکتے ہیں؟ اس بُرے رواج اور مزدوروں کی محنت کے اس ناجائز استعمال کو علاوہ تشدد کسی طرح دور کر سکتا ہے؟

جواب مہاتما گاندھی:۔ یہ مان کر کہ میں سچ مچ ہی مہاتما ہوں اس سوال کا حل کریں گے۔ آپ کے فرمان کے مطابق جیسا کہ آپ سوچ رہے ہیں۔ کروڑوں روپیہ اکٹھا کرنے کا پاپ دان کر دینے

سے دور نہیں ہو جاتا۔ اگر وہ دان نیک نیتی سے دیا گیا ہو۔ تو اس سے اس کے پاپ میں کوئی نیا اضافہ نہ ہوگا۔ اس دان کا یہ بھی نتیجہ ہو سکتا ہے۔ کہ مستقبل میں وہ کروڑ پتی بُرے طریقہ سے روپیہ کمانا چھوڑ دے۔ میں نے یہ دان قبول کر کے کوئی پاپ نہیں کیا۔ جس طرح میلا پانی سمندر میں پہنچ کر سمندر کی پاکیزگی کا حصہ دار بن جاتا ہے۔ اسی طرح بُرا روپیہ جب نیک کام میں لگ جائے تو شدھ ہو جاتا ہے۔ ہاں ایک بات ضروری ہے کہ دانی کی نیت صاف ہو۔ مجھے روپیہ دے کر اُسے کوئی اپنی ذاتی غرض پوری نہیں کرنی ہے۔ نہ ہی میں نے اس دان کو لے کر کوئی سودا کیا ہے۔ غریبوں کا خون چوسنا دس یا بیس کروڑ پتیوں کے ناش کر دینے سے بند ہونے والا نہیں۔ ہاں اس کی جہالت دور کر کے عدم تشدد و عدم تعاون کا طریقہ سکھلا دینے سے ان کا کچھ بھلا ہو سکتا ہے۔ سرمایہ دار بھی اسی سے اپنے دوش سے خلاصی پا لے گا۔ میں نے تو ایسا طریقہ بتلایا ہے۔ جس سے آخر کار دونو حصہ دار بن جائیں۔ نقص ملکیت کا نہیں۔ بلکہ مال کے ناجائز استعمال کا ہے۔ ایک یا دوسرے روپ میں دولت کی ضرورت تو ہمیشہ رہتی ہی ہے۔

عدم تشدد کا راستہ

سوال:۔ انگریزوں کے سامنے ہتھیار چھوڑ کر آپ نے عدم تشدد

کارا ستہ اختیار کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ اس سے ایک سپاہی مشکل
پیدا ہوتی ہے۔ زید کا عدم تشدد بکر کے تشدد کو ابھارتا ہے۔
تشدد والا آدمی پتھر کی مانند ہو جاتا ہے۔ اگر وہ عدم تشدد والوں
کی صحبت میں آوے۔ تو اس پر ان کے عدم تشدد کا اثر نہیں ہوگا۔
اس لئے ایسا معلوم دیتا ہے۔ کہ آپ کی اس سکیم میں کہیں نہ کہیں
نقص ہے۔ کہ ایک چھوٹے سے میدان میں عدم تشدد کامیاب ہو جائے
اگر ایسا ہو تو اس کی قیمت ہی کیا ہے ؟ آپ جو اہنسا کے متعلق دعوے
کرتے ہیں۔ وہ تو قائم نہیں رہ سکتا ؟

جواب:- جیسا آپ خیال کرتے ہیں۔ اتنی جلدی میں عدم تشدد
کا دیوالہ نہیں نکل سکتا۔ عدم تشدد سب سے بڑی طاقت ہے۔
اگر عظیم طاقتوں کا استعمال سب لوگ کر سکیں۔ تو پھر ان طاقتوں کی
اہمیت ہی کہاں رہ جاتی ہے۔ پانی ہمارے روزمرہ کے استعمال کی
چیز ہے۔ اس میں جو طاقت ہے۔ ہم تو ابھی اُس کی بھی تہ کو نہیں
پا سکے۔ ہمیں تو اُس کی ہی شکتی حیران کر دیتی ہے۔ پھر عدم تشدد
جیسی پاک ترین شکتی کے ایک بھاری تجربہ میں ابھی ابھی اہم کامیاب
ہوئے ہیں۔ میں نے تو اس تجربہ کو بہت چھوٹا درجہ دیا ہے۔ بلکہ
مجھے تو اسے عدم تشدد کا درجہ دینے میں بھی تامل ہے۔ لیکن جیسے
کہا جاتا ہے۔ کہ رام نام کے پرتاپ سے پتھر بھی پانی پر تیر گئے تھے۔
اسی طرح عدم تشدد کے نام پر جو کچھ ہوا۔ اس وجہ سے ہم کافی آگے

بڑھے ۔جن کا وشواس اٹل ہے ۔ وہ اس تجربہ کو اور بھی آگے لیجا سکتے ہیں ۔تشدد والے لوگ پتھر ہوتے ہیں ۔ ایسا خیال کرنا مبالغہ آمیز ہے کچھ لوگ ضرور پاگل جیسے بن جاتے ہیں ۔ ایسے غلط اندازوں کی بنا پر اگر ہم اپنی پالیسی کی بنیاد رکھیں گے ۔ تو غلب ہے ۔ ہم بھول میں پڑ جائیں ۔ اصولوں کو معمولی اوصاف تجربہ کی بنا پر قائم کرنا چاہیئے یہی محفوظ راستہ ہے ۔ اور معمولی تجربہ تو یہ بتلاتا ہے ۔ کہ تشدد کا اکثر حصہ عدم تشدد سے کافور ہو جاتا ہے ۔ اس تجربہ کی بنا پر ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں ۔ کہ تیز تشدد کا مقابلہ تیز عدم تش ۔ دسے ہو سکتا ہے ۔

اب گھڑی بھر کے لئے ہم بے جان چیز کے مقابلہ پر غور کرتے ہیں کوئی اگر پتھر سے سر مارے گا ۔ تو اس کا سر ضرور پھوٹے گا ۔ فرض کیجئے پتھر ہماری طرف زور سے آرہا ہے ۔ اور اس کے سامنے جانے سے موت سے دو چار ہونا پڑے گا ۔ راستہ سے کھسک جانے سے ہم اس آفت سے بچ تو سکتے ہیں ۔ لیکن کھسک جانے کا کوئی راستہ ہی نہیں ۔ ان حالات میں مناسب یہ ہے ۔ کہ ہم جس جگہ ہوں ۔ حوصلہ سے وہیں ڈٹ کر چوٹ کو سہاریں ۔ ایک تو اس سے چوٹ کا صدمہ کم سے کم محسوس ہو گا ۔ اور اگر موت بھی آئی تو چنداں ہیبتناک نہ ہو گی ۔

ان ہی خیالات کو طول دے کر ہم یہ بھی نتیجہ نکال سکتے ہیں ۔ کہ پاگل آدمی کا اگر کوئی سامنا نہ کرے ۔ تو آخر کار وہ تھک جائے گا ۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا ۔ کہ کئی فقوس کے محبانہ برتاؤ سے ایک پاگل کا پاگل پن ہی

کافور ہو جائے، بڑے بڑے پاگلوں کے بھی ہوشمند ہو جانے کی مثالیں ملتی ہیں۔ قصہ کوتاہ! مطلب یہ ہے۔ کہ عدم تشدد کی شکتی کا کوئی اندازہ ہی نہیں۔ جس میں حوصلہ ہوگا۔ وہ ضرور اس کا رس چوسے گا۔

اکیلا ستیاگرہی کیا کرے؟

سوال:۔ اوڑیسہ کے ایک بھائی پوچھتے ہیں۔ ایک گاؤں میں ایک ہی ستیاگرہی ہے۔ دوسرے لوگوں کو تشدد و عدم تشدد کا کچھ علم نہیں وہ اکیلا ستیاگرہی تعلیم کہاں سے بووے؟

جواب:۔ آپ کا سوال اچھا ہے۔ ایسا ستیاگرہی اپنے دل کو ٹٹولے۔ اس کے دل میں یقین ہونا چاہیئے۔ کہ اس میں دنیا بھر کے لئے پریم ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی دوسری صفات بھی اس میں موجود ہونی چاہئیں۔ اس کا تعلق اور برتاؤ اپنے گاؤں کے غریب سے غریب آدمی سے لے کر سب کے ساتھ سیوا کا ہونا چاہیئے۔ اسے دیہات کے بھنگی کا کام کرنا ہوگا۔ بیماروں کی دیکھ بھال کرنا ہوگی۔ گاؤں کے جھگڑے نپٹانا۔ گاؤں کے بچوں کو سکھانا۔ گاؤں کے سب لوگ اسے پہچانتے ہوں۔ وہ اگر عیالدار بھی ہو عجزدانہ زندگی بسر کرے اپنے اور پڑوسی کے بچوں میں کوئی تمیز روا نہ رکھے۔ اس کے پاس اگر دولت ہو تو اس پر اپنا ہی حق نہ سمجھتا ہوا بطور ٹرسٹی یا محافظ

کے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے اس میں سے خرچ کرے۔ اپنی ضروریات کو جہاں تک ممکن ہو غریبوں کے پیمانہ پر رکھے اس کے نزدیک ذات پات اور چھوت چھات پھٹکنے نہ پائے۔ سب جاتیوں اور سب مذہبوں والے اس کے ان اوصاف سے واقف ہونے چاہئیں۔ ان میں سے جو جو وصف کسی میں موجود نہ ہو۔ اُسے پورا کرنے کی کوشش کرے۔ جو علم نہ ہو اُسے حاصل کرے۔ اپنا ایک منٹ بھی بیکار نہ جانے دے۔ اس کے ہاں چرخہ ہر روز چلتا رہے اس کا کنبہ منظم ہو۔ ایسا ایک ستیاگرہی بھی سارے گاؤں کی حفاظت کر سکیگا۔ وقت آنے پر دوسرے لوگ ستیاگرہی نہ ہوتے ہوئے بھی ایسا برتاؤ کرنے لگیں گے۔ جیسا کہ وہ بھی اسی کی فوج میں سے ہوں۔ وہ ایسا کریں یا نہ کریں۔ اندرونی یا بیرونی حملہ کی صورت میں وہ اکیلا ہی اس کا عدم تشدد کی بنا پر تدارک کرے گا۔ اور اسی کوشش میں مٹ جائے گا۔ میرا پختہ یقین ہے۔ کہ ایسا ستیاگرہی کبھی اکیلا نہیں رہے گا۔ یہاں مجھے یہ بھی کہنا چاہیئے۔ کہ سیواگرام میں ستیاگرہی کے طور پر میں اکیلا ہی آیا تھا۔ اِسے خوش قسمتی سمجھئے یا بدقسمتی میں اکیلا نہ رہ سکا۔ سیواگرام سے باہر کے لوگ آ آ کر میرے پاس بس گئے۔ یہاں رہنے والوں میں سے کسی کو ستیہ اگرہی گن جا سکتا ہے یا نہیں۔ یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ امید تو یہ ہے۔ کہ ایسے لوگ تیار ہوئے ہوں گے۔ اور ہو رہے ہوں گے۔ مگر میں یہ

دعوے نہیں کرتا۔ کہ جن شرطوں اور صفات کو میں مانتا ہوں۔ وہ سب ہی مجھ میں موجود ہیں۔ پھر بھی اگر ان سب شرائط پر عمل کرنے کی میری تیاری نہ ہوتی اور ان میں سے بہت سی شرائط پر میں تھوڑا بہت عمل نہ کرتا۔ تو جو کچھ میں نے اوپر لکھا نہ لکھ سکتا۔ فی الحال تو میرا مقصد ضرور یہی ہے۔ کہ سیوا گرام ایک آدرش گاؤں بن جائے۔ میں جانتا ہوں۔ کہ یہ کام اتنا ہی مشکل ہے جتنا ہندوستان کا آدرش بننا۔ لیکن سیوا گرام کا کام تو کسی نہ کسی دن اکیلے آدمی سے مکمل ہو جانا ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن سارے ہندوستان کو آدرش بنانے کا کام ایک آدمی کی زندگی کی معیاد سے بہت زیادہ ہے۔ اگر کوئی ایک آدمی ایک گاؤں کو آدرش بنا دے۔ تو اس نے ہندوستان کے لئے ہی نہیں۔ دنیا بھر کے لئے راستہ کھول دیا۔ متلاشی کو اس سے آگے جانے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے۔

عدم تشدد اور پاکستان

سوال :۔ ایک گجراتی مسلمان بھائی لکھتے ہیں" میں عدم تشدد کو مانتا ہوں۔ اور پاکستان کو بھی۔ اب پاکستان کے لیئے اس کے مطابق کیسے کام کروں ؟

جواب : جس چیز میں انصاف نہیں وہ عدم تشدد سے حاصل نہیں کی جا سکتی۔ جیسا کہ چوری عدم تشدد سے نہیں کی

جا سکتی۔ پاکستان کو جیسے میں سمجھتا ہوں وہ انصاف پر مبنی نہیں
ہے۔ ہاں اگر آپ ایسا مانتے ہیں۔ تو آپ اس کے لئے اندولن ضرور
کر سکتے ہیں۔ پر اگر آپ عدم تشدد کی بنا پر کریں گے۔ تو پہلے آپ کو
پاکستان کی مخالفت کرنے والوں کو سمجھانا ہوگا۔ لوگوں پر یہ اثر
پڑ جانا چاہئے۔ کہ آپ اس سلسلہ میں بے غرضانہ کام کر رہے ہیں۔
مخالفوں کی بات عزت کے ساتھ سنیں۔ ان کی اگر بھول ہو تو با عزت
طور پر ان کو سمجھاویں۔ آخر کار فرض کیجئے۔ کہ یہ لوگ آپ کی نہیں سنتے۔
لیکن آپ کے دل میں اس چیز کی سچائی قائم رہتی ہے۔ تو ان لوگوں
کے خلاف جو آپ کی راہ میں روڑا اٹکاتے ہیں۔ آپ غیر متشددانہ عدم
تعاون کر سکتے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے آپ کو مدمخالف کو نقصان
نہیں پہنچانا چاہیئے۔ اور نہ ہی ایسی خواہش دل میں لانی چاہیئے
ہاں اگر آپ کو نقصان ہوتا ہو تو آپ اُسے برداشت کریں۔ آپ کا
مقابلہ ہر طرح سے مناسب خیال کیا جاتا ہو۔ تو تب کہیں یہ سب کچھ
ممکن ہو سکتا ہے۔

آپ اپنے گھر کو سنبھالیں

سوال:۔ آپ اپنے لڑکے کو ہی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتے۔
وہ اپنی مرضی کا مالک بنا ہؤا ہے۔ یہ کیا اچھا نہ ہوگا۔ اگر آپ اپنے
گھر کو ہی سنبھالیں؟

جواب :- یہ ایک طعنہ بھی خیال کیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں اسے طنز کی روشنی میں نہیں لیتا۔ کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا ہو۔ اس سے پیشتر ہی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہو چکا ہے۔ میں آواگون (پُنر جنم) میں یقین رکھنے والا آدمی ہوں۔ اس دنیا کا تمام رشتہ ناطہ گذشتہ جنم کے سنسکاروں کا نتیجہ مانتا ہوں۔ ایشور کا قانون ناقابل تغیر ہے۔ وہ ایک اٹل ناصح اور ریفارمر ہے۔ اس کا پار کوئی نہیں جا سکتا۔ اپنے پُتر کے بارے میں میں جو کچھ سمجھتا ہوں وہ یہ ہے۔ کہ میرے گھر میں اگر کپتر پیدا ہوا ہو۔ تو اُسے بھی میں اپنے پاپ کا ہی پھل سمجھوں گا۔ میرے پہلے پُتر کا جنم صرف ایک عالم بیہوشی کا نتیجہ ہے۔ وہ بڑا بھی اسی زمانہ میں ہو گیا۔ جب میں بھی ابھی بڑھ رہا تھا۔ اس وقت میں بھی اپنے آپ کو کم پہچانتا تھا۔ اپنے آپ کو مکمل طور پر پہچاننے کا دعوےٰ تو اب بھی میں نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ میں ضرور سمجھتا ہوں۔ کہ اس وقت کی نسبت اب میں اپنے آپ کو بہتر جانتا ہوں۔ وہ کافی عرصہ تک مجھ سے علیحدہ رہا ہے۔ اس کی تعمیر کا کام میرے زیر سایہ نہ تھا۔ اس کا بد یا بدترین نتیجہ جو کچھ بھی ہوا۔ اس کی میرے خلاف یہ شکایت رہی ہے۔ کہ میں نے غلطی سے جس چیز کو پرتارتھ سمجھ رکھا ہے۔ اس میں میں نے اس کی اور اس کے بھائیوں کی آہوتی دے دی ہے دوسرے لڑکوں نے بھی تھوڑی یا بہت کچھ نہ کچھ اسی قسم کی شکایت اگرچہ

ہچکچاتے ہی سہی۔ مگر کی ضرور ہے۔ انہوں نے فراخدلی سے مجھے معاف کر دیا ہے۔ بڑے لڑکے نے تو زندگی میں جو جو ہیر پھار میں نے کیئے ہیں۔ ان کا علانیہ تجربہ کیا ہے۔ اس نے جو جو گناہ میرے مانے ہیں۔ انہیں میں بھول نہیں سکا۔ ان ہی حالات میں میں نے اُسے کھویا ہے۔ یہ جان کر کہ اُس کی وجہ میں خود ہی ہوں۔ تسلی سے بیٹھ گیا ہوں۔ اس کے باوجود بھی میری ہمیشہ ایشور سے یہ پرارتھنا رہی ہے۔ کہ وہ اُسے عقل سلیم عطا کرے۔ اور مجھ میں اگر اس کی سیوا کرنے میں کسی قسم کی کمی رہ گئی ہو۔ تو اس کے لئے مجھے معاف کر دے۔ میرا پختہ یقین ہے۔ کہ انسان فطرتاً ایسا ہے۔ کہ خود بخود درستی کی طرف آجاتا ہے۔ اس لئے میں نے اپنی امید ابھی تک نہیں توڑی۔ کہ وہ اپنی اس خواب غفلت سے نہیں جاگے گا۔ باقی سنسار کی طرح وہ بھی میرے عدم تشدد کے لئے ایک میدان ہے۔ کامیابی کب ہو گی۔ اس کی میں نے کبھی چنتا نہیں کی۔ میری تسلی کے لئے یہی کافی ہے۔ کہ جو کچھ مجھے سوجھے۔ اسے پورا کرنے میں ڈھیلا نہ رہوں۔ گیتا کے اس فرمان کو "کہ انسان کا فرض صرف کام کرنا ہے۔ نہ کہ پھل کی خواہش کرنا" میں بمثل کندن سمجھتا ہوں۔

عدم تشدد ناممکن ہے

سوال:۔ عدم تشدد ایک مشکل ہتھیار ہے۔ جس آدمی نے عدم تشدد کی طاقت کو مکمل طور پر سمجھ لیا ہے۔ اس کا مقابلہ دنیا کی کوئی بھی دوسری طاقت نہیں کر سکتی۔ اسے ہم اصولاً بھلے ہی منظور کر لیں۔ لیکن جب یہ خیال کرنے بیٹھتے ہیں۔ کہ عمل میں یہ کہاں تک ممکن ہے۔ تب دوسرے کئی سوالات کھڑے ہو جاتے ہیں۔ شاید ایسا کوئی مہایوگی ہو۔ جو شیر۔ چیتا۔ بھیڑیا جیسے خونخوار جانوروں کو بھی اپنے اثر سے گائے۔ بکری جیسا مسکین بنا سکے۔ لیکن عام لوگ تو شیر۔ بھیڑیا وغیرہ سے بچنے کے لئے بندوق یا دوسرے ایسے ہی کسی ذریعہ کو استعمال کر سکتے ہیں۔

آپ جیسا بالاترین اثر رکھنے والا آدمی خیالات کی قوت سے ہی دوسروں کو جیت سکتا ہے۔ لیکن عام لوگ تو اپنے فائدہ کے لئے کچہری۔ وکیل یا دیگر ذرائع ہی استعمال میں لاتے ہیں۔ قدیم زمانہ میں بھی عدم تشدد کی طاقت حاصل کر کے عمل میں لانے والے اشخاص ہم سنے والے ہی سنے ہیں۔ بھگوان بدھ نے تھوڑے وقت کے لئے اپنے خیالات کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کی۔ مگر بعد میں لوگ بھگوان بدھ کی فلاسفی کو بھول گئے کی بوجھ کی مانند پھر پہلے کی طرح عمل کرنے لگے۔ گذشتہ زمانہ کا خیال کرتے ہوئے یہ بات ناممکن معلوم دیتی ہے۔ کہ لوگ زیادہ سے

زیادہ عدم تشدد کی طرف جائیں گے۔ اسی وجہ سے ہمارے رِشیوں نے لوگوں کو ایک طرف کر کے عدم تشدد و صداقت کو حاصل کرنے کے لئے جنگلوں کی شرن لی۔ آپ کے ذاتی اثر سے تھوڑے سے لوگ بھلے ہی عدم تشدد کی مشق کرنے کو تیار ہو جائیں لیکن مجموعی طور پر لوگوں کا اس راستہ پر جانا ناممکن معلوم دیتا ہے۔ جیسے الف ب پڑھتا ہوا بچہ تلک گیتا جیسے گرنتھ نہیں سمجھ سکتا۔ اسی طرح عدم تشدد ایک مشکل ہتھیار ہے۔ اس چیز کو عیش و آرام میں پڑے ہوئے لوگ کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

آپ کی روحانی طاقت کی روشنی سے کئی لوگ بھلے ہی چکا چوندھ میں آجائیں۔ مگر اس چیز کو سبھی لوگ ماننے لگیں۔ یہ بات ناممکن ہے جہاں عیش پرستی کیسے کی جائے۔ اس میں مقابلہ ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں سے عدم تشدد کو اپنی زندگی میں لانے کی امید کیسے کی جا سکتی ہے۔ اور ایک یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ عدم تشدد سب سے مشکل چیز ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے بعد اور کوئی چیز حاصل کرنے کے قابل نہیں رہتی۔ جیسے کسی آدمی کو انجینیر یا ڈاکٹر بننا ہو۔ تو اُسے کالج میں جانے کے سوا دوسرا چارہ ہی نہیں ہے۔ اسی طرح اس سے بھی نہایت مشکل عدم تشدد کے شاستر کے لئے کتنی تیاریوں کی ضرورت ہوگی۔ کتنے ہی مہاودیالیہ کھولنے پڑیں گے۔ جن میں صرف عدم تشدد و صداقت کو حاصل کرنے کا سبق سکھلانا پڑے گا۔ اس

کے مقابلہ میں آج توعیش و آرام کیسے کیا جائے اور کیسے انہیں بڑھایا جائے اہنی باتوں کی کھوج ہوا کرتی ہے۔ ایسے لوگوں کو عدم تشدد کی طرف کیسے لایا جائے۔ کیا وہ اِدھر راغب ہو سکتا ہے۔ آج تو یہ ناممکن سا لگتا ہے۔ آپ اس کا جواب دیں گے۔ تو میں آپ کا احسان مند ہوں گا۔"

مہاتما گاندھی جی کا جواب:- اس چٹھی میں لکھنے والے نے جو شکوک اُٹھائے ہیں۔ یہ کئی لوگوں کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ میں نے الگ الگ جگہ ایسے شکوک کا جواب بھی دیا ہے۔ مگر چونکہ کانگرس ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کی وجہ سے لوگ اس بارے میں سوچنے لگ گئے ہیں۔ مندرجہ بالا شکوک پر غور کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

مندرجہ بالا چٹھی کا مطلب یہ ہے۔ کہ عدم تشدد کا راج ناممکن ہے۔ اور ایسا نہیں معلوم دیتا۔ کہ عدم تشدد کی طرف لوگوں نے کچھ ترقی کی ہے۔ بدھ جیسوں نے کوشش کی۔ تھوڑی بہت کامیابی ان کے زندہ رہتے ہوئے ہی انہیں ملی۔ مگر اس کے بعد تو لوگ جہاں تھے۔ وہیں کے وہیں کھڑے ہیں۔ عدم تشدد ذاتی دھرم تو ہو سکتا ہے۔ لیکن عوام کے لئے وہ بیکار ہے۔ اور ہندوستان کو بھی اپنی نجات کے لئے تشدد کا راستہ اختیار کرنا پڑیگا۔ میں سمجھتا ہوں۔ اس دلیل کی جڑ میں ہی خرابی ہے۔ آخری پیرا

تو ضرور غلط ہے۔ کیونکہ کانگرس نے سوراجیہ حاصل کرنے کے لئے تو عدم تشدد کا راستہ قائم رکھا ہی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کانگرس ایک قدم آگے بڑھی ہے۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے یہ صاف فیصلے کیا ہے۔ کہ اندرونی فساد کو نپٹانے کے لئے بھی عدم تشدد کو ہی استعمال کرنا ہے۔ صرف بیرونی حملہ کے لئے کانگرس نے فوج کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اس میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں۔ کہ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی خاصی اچھی تعداد نے اس ریزولیشن کے خلاف رائے ظاہر کی ہے۔ ایسے اصولی سوال میں اگر اختلاف ہو تو اسے دھیان میں تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ کانگرس کی پالیسی کا فیصلہ تو اکثریت ہی کر سکتی ہے۔ مگر اقلیت کی رائے اس سے ختم نہیں ہو جاتی۔ وہ رائے تو رہتی ہی ہے۔ جہاں عمل کا سوال آئے۔ وہاں اقلیت کا اکثریت کے پیچھے چلنا فرض ہوتا ہے۔ جہاں اصولی اختلاف ہو۔ وہ اختلاف قائم رہتا ہے۔ اور اس کے مطابق موقعہ آنے پر عمل میں بھی فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ مکمل عدم تشدد کو سماج میں بھی جگہ ملی ہے۔ اور کہ ساماجک اہنسا بیچ مچ آگے بھی بڑھی ہے۔ اب یہیں کھڑی رہے گی۔ آگے بڑھے گی یا نہیں۔ یہ الگ سوال ہے۔ اس لئے چٹھی لکھنے والے کے شکوک کو کانگرس کے ریزولیشن سے تو مدد نہیں ملتی۔ الٹے اس ریزولیشن سے تو خاص حد تک ان کے شکوک رفع ہو جانے چاہئیں۔" میں ایک

بڑا آدمی ہوں۔ میرے زیر اثر لوگوں نے کچھ کیا بھی۔ مگر میرے بعد وہ سب ختم ہو جائے گا۔" ایسا کہنا قطعی ٹھیک نہیں۔ کانگرس میں کئی دماغی آدمی پڑے ہوئے ہیں۔ مولانا خود امراد مولانا ابوالکلام آزاد بڑے مدمغ آدمی ہیں۔ وہ تیز دماغ کے آدمی ہیں۔ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ عربی۔ فارسی کے مطالعہ میں ان کے مقابلہ کا آدمی ملنا مشکل ہے۔ تجربہ نے انہیں سکھلایا ہے۔ کہ عدم تشدد سے ہی ہندوستان آزاد ہوگا۔ اندرونی جھگڑوں کو فرو کرنے کے لئے عدم تشدد سے کام لیا جائے۔ یہ انہیں کا اصرار تھا۔ اور پھر پنڈت جواہر لعل جی نہرو کسی کے اثر میں آجائیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ ان کا انگریزی کا مطالعہ کسی سے کم نہیں۔ کافی سوچ کے بعد انہوں۔ آزادی حاصل کرنے کے لئے عدم تشدد کا راستہ اختیار کیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ کہ اگر عدم تشدد کے ذریعے سوراجیہ نہ مل سکے اور تشدد کے ذریعہ ملتا ہو۔ تو وہ تشدد کا راستہ اختیار کرنے میں تامل نہ کریں گے۔ لیکن ہمارے مضمون کے لئے یہ بات بے موقعہ ہے۔ دوسرے بھی کئی ایسے اونچے درجہ کے اشخاص ہیں۔ جو سوراج حاصل کرنے کے لئے عدم تشدد کا راستہ ہی ٹھیک سمجھتے ہیں۔ میرے مرنے کے بعد یہ سب لوگ عدم تشدد کو چھوڑ دیں گے ایسا خیال تنگ کرتا ان کی اور بنی نوع انسان کی ہتک کرنا ہے ہر ایک انسان میں انسانیت ہے یہ مان کر ہمیں چلنا چاہئے۔ اگر ہم

ایک دوسرے کے لئے اتنی عزت کا خیال دل میں رکھیں۔ تو ہم ترقی کریں گے۔ اگر کمزور ہوں گے۔ تو ایک دوسرے کی مدد سے اوپر چڑھیں گے۔

چھٹی لکھنے والے یا دوسرے کوئی یہ تو نہیں مانتے ہوں گے۔ کہ کانگرس نے اور بہت سے لیڈروں نے عدم تشدد کو آخری نمسکار کر دیا ہے۔ میں نے جو بتایا ہے اس حد تک تو کانگرس کی پالیسی صاف ہو گئی ہے۔ اور قائم رہی ہے۔ میں مانتا ہوں۔ کہ عدم تشدد کی وسعت کا خیال کرتے ہوئے کانگرس کی بتلائی ہوئی حد عدم تشدد کو بہت محدود کر دیتی ہے۔ اس سے عدم تشدد کی عملی شکل ڈھک جاتی ہے۔ مگر جو دلیل چل رہی ہے۔ اس کیلئے تو کانگرس کا محدود عدم تشدد پورا کام دیتا ہے۔ کیونکہ یہاں میں اتنا ہی بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ کہ عدم تشدد کا میدان بڑھتا ہی چلا آتا ہے۔ کانگرس کا عدم تشدد کو محدود شکل میں منظور کرنا اس دلیل کی کافی تائید کرتا ہے۔

جب سے کچھ بھی تواریخی ثبوت ملنے شروع ہوئے ہیں۔ اس وقت سے لے کر آج تک کے زمانہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ تو ہم دیکھتے ہیں کہ آدمی عدم تشدد کے راستہ پر ہی چلتا آیا ہے۔ ہمارے بزرگ ایک دوسرے کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ بعد میں شکار کھیلنے لگے۔ اور اس سے گذر اوقات کرنے لگے۔ پہلے انہیں ایک دوسرے کو قتل کرنے

سے نفرت ہوئی۔ پھر شکار پر گذارہ کرنے سے بھی شرما گئے۔ اس لئے انہوں نے زمین کھودنا شروع کیا۔ وہ زمین سے کئی قسم کی خوراک حاصل کرنے لگے۔ اس نے جنگل میں منگل کر دیا۔ ادھر اُدھر بھٹکتے ہوئے زندگی بتانے کی بجائے اس نے ایک جگہ جم کر رہنا پسند کیا۔ گاؤں اور شہر بسائے۔ خاندانی احساسات پیدا ہوئے۔ جس نے آگے بڑھ کر سماجک خیال کی شکل اختیار کر لی۔ یہ سب درجہ بدرجہ بڑھتے ہوئے عدم تشدد کے نشان ہیں۔ تشدد والی عادات آہستہ آہستہ کم ہوتی گئیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا۔ تو جس طرح بہت سے نچلے درجہ کے جانوروں کی جاتیاں ختم ہو گئیں۔ اسی طرح بنی نوع انسان بھی آج تک ختم ہو گیا ہوتا۔

جو کئی پیغمبر اور اوتار ہو چکے ہیں۔ انہوں نے بھی کم و بیش عدم تشدد کا اپدیش کیا ہے۔ کسی نے بھی تشدد کا اپدیش کرنے کا دعوےٰ ہی نہیں کیا۔ کریں بھی کیسے؟ تشدد کا اپدیش کرنا ہی کیا تھا۔ بطور جانور انسان تشدد کرنے والا ہی ہے۔ بطور روحانیت کے وہ عدم تشدد والا ہے۔ جب انسان کو روح کا خیال آتا ہے۔ تب وہ تشدد والا رہ ہی نہیں سکتا۔ یا تو وہ عدم تشدد سیکھ جائے گا۔ یا تباہ ہو جائے گا۔ اسی لئے پیغمبروں نے صداقت۔ اتفاق۔ برادرانہ محبت۔ محنت اور انصاف وغیرہ کا اپدیش کیا ہے۔ تو بھی تشدد آج تک چلا آتا ہے۔ اور وہ اس حد تک کہ چیٹھی لکھنے والے جیسا عقلمند

انسان اسے ہی آخری ذریعہ تصور کرتا ہے۔ مگر جیسا ہیں نے اوپر ظاہر کیا ہے۔ تواریخ و تجربہ اس کے خلاف ہے۔

اگر ہم اتنا مان لیں۔ کہ آج تک عدم تشدد دن بدن بڑھتا ہی گیا ہے۔ تو اس سے خود بخود یہ ثابت ہوتا ہے۔ کہ یہ آگے بڑھتا ہی جائے گا۔ اس دنیا ہیں کوئی چیز مستقل نہیں ہے۔ سب کچھ گذرنے والا ہے۔ آگے نہ بڑھے تو پیچھے گرنا ہی ہوگا۔ رفتار زمانہ کے باہر (گتی چکر) کوئی جا ہی نہیں سکتا۔ اس کے باہر تو صرف ایک ایشور ہی ہے۔ اگر ہے تو۔ آج جو جنگ جاری ہے۔ اُسے تشدد کی آخری حد کہا جا سکتا ہے۔ لیکن میرے خیال ہیں یہ تشدد کی ہولی ہے۔ لوگوں کے دلوں ہیں عدم تشدد کی جتنی آج قدر ہے۔ اتنی کبھی نہیں تھی۔ یہ ہیں تو دیکھ ہی رہا ہوں۔ اور جتنے ثبوت مغرب سے میرے پاس آتے رہتے ہیں۔ وہ بھی یہی بتاتے ہیں۔ ایسی شبھ گھڑی ہیں کانگرس نے خواہ کسی شکل ہیں ہو۔ عدم تشدد کی شرن لی ہے۔ چٹھی لکھنے والے اور ویسے دیگر شکوک رکھنے والے اصحاب کو ہیں دعوت دیتا ہوں۔ کہ وہ شک و شبہ سے بالاتر ہو کر عقیدت کے ساتھ اس عدم تشدد کے میدان ہیں کود پڑیں۔

"دیکھو! موتی نکالنے والا امر جیوہی موتی نکالنے کے لئے سمندر ہیں غوطہ لگاتا ہے۔ دیکھو! موت کے منہ ہیں جا کر وہ موتیوں کی مٹھی بھر کر اپنے دل کا درد مٹاتا ہے۔ کنارے پر کھڑے تماش بین کے

ہاتھ ایک کوڑی بھی نہیں آتی۔

پریم کا راستہ آگ کا شعلہ ہے۔ اسے دیکھ کر آدمی پیچھے بھاگتا ہے۔

لیکن جو اس کے اندر چلا گیا ہے۔ اسے تو مہان سُکھ ہی ملتا ہے۔ جلتا تو دیکھنے والا ہی ہے۔

ہوائی جہاز کے مقابلہ میں اہنسا

سوال :۔ ایک چھوٹی سی لڑکی نے پرارتھنا سے اُٹھتے ہوئے مہاتما جی سے یہ سوال کیا۔ اگر دشمن ہوائی جہاز سے آگر ہم پر گولے برسائے۔ تو اس کے سامنے ستیاگرہ کیسے ہو؟ ہوائی جہاز تک تو ہم پہنچ بھی نہیں سکتے؟

جواب :۔ ستیاگرہ کیسے کریں! اپنی ذات کی پاک قربانی دے کر ہم مر مٹیں گے۔ مگر گردن نہ جھکائیں گے۔ اپنی آن نہ چھوڑیں گے۔ غلام نہ بنیں گے۔

سوال :۔ لڑکی نے پوچھا۔ اگر ہم سب صفا چٹ ہو گئے۔ تو سوراجیہ کون لے گا؟

جواب :۔ یدھ کے اختتام پر جو جیتا بچے گا۔ وہ سوراجیہ لے گا۔ ہتھیار بند جنگ میں فوج کی فوج کٹ جاتی ہے۔ جو باقی رہ جاتے ہیں۔ فتح کا سہرہ انہی کے سر بندھتا ہے۔ مگر اس وجہ

سے یہ کوئی نہیں کہتا۔ کہ ہتھیار بند جنگ بے فائدہ ہوئی۔ مگر ہم یہ فرض کر لیتے ہیں۔ کہ ستیاگرہ کی جنگ میں فتح کے ہم ساتھی نہ بن سکیں گے۔ تو ایسا کہنا کہ ستیاگرہ بیفائدہ ہے۔ یہ ٹھیک ٹھیک ہوگا۔ ہتھیار بند جنگ کے مقابلہ میں ستیاگرہ کے متعلق یہ کہنا کہ ہم سرگرم امر بنتے ہیں۔ زیادہ موزون ہے۔

اہنسا کیسے سیکھی جائے؟

سوال :- آپ اہنسا اہنسا چلاتے رہتے ہیں۔ مگر اس سے لوگوں میں اہنسا پیدا نہیں ہو سکتی۔ اب جب کہ آپ نے گجراتی میں لکھنا شروع کیا ہے۔ تو آپ کو لوگوں کو بتلانا چاہیئے۔ کہ طاقتور کی اہنسا (non-violence of the strong)

کو یا شدہ اہنسا کو وہ کس طرح اپنی زندگی میں ڈھال سکتے ہیں؟

جواب :- سوال آپ کا اچھا ہے۔ اور ٹھیک موقع پر پوچھا گیا ہے۔ آپ کے پوچھنے سے پہلے ہی میں اس سوال کا جواب کئی بار ٹکڑے ٹکڑے کر کے کئی جگہ پر دے چکا ہوں۔ مگر مجھے تسلیم کرنا چاہیئے کہ مجھے یاد نہیں آتا۔ کہ اس ایک سوال کو الگ لے کر میں نے اس پر کبھی لکھا ہے۔ اس پر جتنا چاہیئے۔ اتنا زور میں نے نہیں دیا۔ میرا وقت سرکار کے ساتھ لڑنے کی تیاری میں گیا ہے۔ آج تک ٹھیک بھی یہی تھا۔ مگر ہم نے دیکھا کہ ایسا کرنے میں ہماری اہنسا لنگڑی

رہی ہے۔ طاقتوروں کی اہنسا کی طرف تو ہم نے جھانکا بھی نہیں۔ اب اگر ہمیں آگے بڑھنا ہے۔ تو پہلی اہنسا کو تھوڑے وقت کے لئے ہمیں بھول جانا چاہیئے۔ ہم لوگوں میں سچی اہنسا آ گئی تو ہم پہلی اہنسا کو اس کی موزوں شکل میں دیکھ سکیں گے۔ اور سو فیصدی کامیابی حاصل کر سکیں گے۔ میں کانگرس سے نکل گیا ہوں۔ اس لئے کانگرس کے نام پر اکیلا بھی سول نافرمانی نہیں کروں گا۔ مگر انفرادی طور پر تو جب ضرورت ہو گی تب کر سکتا ہوں۔ لیکن جب شدہ اہنسا کا سبق سیکھا جا رہا ہو۔ اس دوران میں سول نافرمانی یکدم بند رہے گی۔ ایسا ماننے کی کوئی وجہ نہیں۔ مگر میرے خیال کے اہنسک دل میں بھرتی ہونے والوں کو اپنے لئے فوری سول نافرمانی کی امید نہ رکھنی چاہیئے۔ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ جب تک انہوں نے شدہ اہنسا کا تجربہ نہیں کیا۔ تب تک وہ سول نافرمانی کر ہی نہیں سکتے۔ عدم تشدد کے نام سے ہی تمہیں بھڑکنا نہیں جانا چاہیے اس عدم تشدد کو ہم اچھی طرح سمجھ لیں۔ اور اس کے ٹھیک استعمال کو ہم جان لیں۔ تو اس کا استعمال اتنا مشکل نہیں ہے۔ جتنا فرض کیا جاتا ہے بھارت ساوتری کی رٹ لگانا ضروری ہے۔ رشی کوی پکار پکار کر کہتا ہے "جس دھرم میں آسانی سے شدھ انکھ اور کام سمائے ہوئے ہیں۔ اس دھرم کا ہم کیوں آچرن نہیں

کرتے ہیں یہ دھرم تلک لگانے اور گنگا اشنان کرنے کا نہیں۔ بلکہ اہنسا اور ستیہ آچرن کا ہے۔ ہمارے پاس دو غیر فانی الفاظ ہیں۔ (۱) "اہنسا پرم دھرم ہے"۔ (۲) "ستیہ کے سوائے دوسرا دھرم نہیں"۔ اس میں سب ارتھ اور کام آجاتے ہیں۔ پھر ہم کیوں ہچکچاتے ہیں؟ ایسا ہوتے ہوئے یہ بھی ماننا پڑتا ہے۔ کہ جو آسان ہے۔ وہی لوگوں کو مشکل معلوم دیتا ہے۔ یہ ہماری نادانی کا مظہر ہے یہاں لفظ نادانی کو ہتک آمیز خیال نہ کرنا چاہیئے۔ یہ میں نے انگریز داناؤں کے الفاظ کا ترجمہ کیا ہے۔ اس نادانی کے زیر اثر رہ کر ہم نے یہ سمجھ لیا ہے۔ کہ ستیہ اور اہنسا کا پالن بہت مشکل ہے۔

یہ نقص ہمیں دور کر دینا چاہیئے۔ پہلے تو یہ قول اپر نگیا کرنا چاہیئے۔ کہ جھوٹ اور تشدد کے ذریعہ خواہ کتنا ہی فائدہ ہو۔ ہمارے لئے وہ غیر مفید ہے۔ کیونکہ وہ فائدہ فائدہ نہیں بلکہ نقصان دہ ہی ہوگا۔ اتنا ہم مستقل طور پر مان لیں تو دونو صفات یعنی ستیہ اور اہنسا کو اپنے آپ میں آسانی سے لا سکتے ہیں۔

مگر ہم تو یہاں اہنسا کو ہی لیں گے۔ آج تک ہم نے چرخہ وغیرہ کو اہنسا کی آزاد شکل مانی ہے۔ اور وہ ہے بھی۔ میں مان

لیتا ہوں۔ کہ اہنسا پر پورا عمل کرنے والے نے اپنے ماتا پتا۔ پتر وغیرہ اور پتی پتنی۔ نوکر چاکروں کے ساتھ کا تعلق تو عدم تشدد کا کر ہی لیا ہوگا۔ یا کرے گا۔ مگر دیش میں ہل چل ہو تو وہ کیا کرے گا؟ ہندو مسلمانوں میں دنگا و فساد ہو تو اس کے پاس کیا علاج ہے؟ چور ڈاکوؤں کے فساد کے وقت وہ کیا کرے گا؟ جب یہ لڑائیاں ہیں تب مر مٹنے کا خیال ہی فقط کافی نہیں۔ اس طرح مر مٹنے کی قابلیت بھی ہونی چاہیئے۔ میں ہندو ہوں تو مجھے مسلمانوں اور دیگر مذہب والوں کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق جوڑنا ہے۔ اپنے آس پاس رہنے والے غیر مذہب والوں کے ساتھ بھی ہمیں ایسا سلوک روا رکھنا چاہیئے۔ جیسا ہم اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ ان کی سیوا کے موقعہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی سیوا کرنی چاہیئے۔ اہنسا کی ڈکشنری میں ڈر کے لئے تو کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ اس طرح بھائی چارہ پیدا کرنے والا ہی مذہبی مساوات میں اپنے آپ کو کھپا سکتا ہے۔ یہی بات چور ڈاکوؤں کے بارہ میں بھی لاگو ہوتی ہے۔ چور ڈاکوؤں کے عام طور پر مذہب نہیں ہوتے۔ مگر اتنا تو ہم مانتے ہیں۔ کہ چور ڈاکو کسی نہ کسی مذہب میں سے ہی آتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ہمیں تعلق پیدا کرنا ہے۔ مثال کے طور پر روی شنکر مہاراج اس طرح کے ہیں۔

انہوں نے یہ بڑا کام آسانی سے کیا ہے ۔ ایسا کرنے والے بہت
تھوڑے ملیں گے ۔ یہ میدان بہت لمبا ہے ۔ اس میں شدہ
پریم کے علاوہ دوسری کسی لیاقت کی ضرورت نہیں روی شنکر
مہاراج کو انگریزی کا کچھ بھی گیان نہیں ۔ گجراتی بھی بیوپار چلانے
لائق ہی جانتے ہیں ۔ ایشور نے انہیں پڑوسی کے لئے پریم کرنے
کا مہان گن بخشا ہے ۔ اور ان کی سادگی بھی ایسی ہے ۔ کہ اس
پر سب کی آنکھ جاتی ہے ۔

لہذا جہاں جہاں اپنے ہر ایک کام میں اہنسا برتنے والے
لوگ رہتے ہوں ۔ وہاں ہر ایک کو اپنے لئے پروگرام بنا لینا
چاہیئے ۔ اس میں اتنی عقلمندی برتی جائے کہ وہ اپنے ایک ایک
منٹ کا حساب دے سکے ۔

کیا اسلام دین خدائی ہے ؟

مہاتما گاندھی جی تحریر فرماتے ہیں :۔ ایک مسلم اخبار میں ایک
مصنف نے تحریر کیا تھا ۔ کہ اگر میں یہ مانتا ہوں ۔ کہ اسلام دین
خدائی ہے ۔ اور محمدؐ صاحب خدا کے پیغمبر ہیں ۔ تو مجھے کھلے طور
پر ایسا کہنا چاہیئے ۔ اس سے مسلمانوں کا شک دور ہو جائے گا ۔
اور شاید ہندو مسلم اتحاد بھی آسانی سے ہو سکے گا ۔ یہ مضمون
قریب ایک ماہ پہلے پڑھا تھا ۔ اس کا جواب دینے سے کچھ فائدہ ہو گا ۔

ایسا میں محسوس نہیں کرتا۔ لیکن حال میں مسلمانوں کے خیالات سمجھنے کے لئے جتنا ہو سکتا ہے۔ اتنے مسلم اخبار میں پڑھتا ہوں۔ ان میں بڑا زہر اگلا جاتا ہے۔ اور جان بوجھ کر یا انجانے اس قدر جھوٹ لکھا جاتا ہے۔ کہ اگرچہ اسلام کے بارے میں میرے خیالات کو ساری دنیا جانتی ہے۔ تو بھی میں اُسے یہاں ظاہر کرنا ضروری خیال سمجھتا ہوں۔

میں اسلام کو ضرور ایک دین خدائی مانتا ہوں۔ اس لئے قرآن شریف کو بھی خدا کا عطیہ مانتا ہوں۔ اور اسی طرح محمدؐ صاحب کو بھی ایک پیغمبر مانتا ہوں۔ ہندو دھرم۔ عیسائی دھرم اور پارسی دھرم کے بارے میں بھی میرے یہی خیالات ہیں۔ پیغمبر بہت سے ہو چکے ہیں۔ اور انہوں نے بہت سے دھرم چلائے ہیں۔ اُن میں سے بہتوں کا آج نام و نشان بھی نہیں رہ گیا ہے۔ کیونکہ وہ سب دھرم اور پیغمبر اپنے وقت کے لئے تھے۔ کتنے ہی خاص خاص دھرم آج کل ہیں۔ جتنا ممکن تھا۔ اتنے مختلف مذاہب کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ سب مذاہب کو ایک ہی کرنا اگر موزوں اور ضروری ہو۔ تو ان سب کی ایک بڑی چابی ہونی چاہیئے۔ یہ چابی ستیہ اور اہنسا ہے۔ اس چابی سے جب میں کسی مذہب کی پیٹی کھولتا ہوں۔ تو مجھے ایک مذہب کا تعلق دوسرے مذہبوں کے ساتھ جوڑنے میں ذرا بھی دقت نہیں ہوتی۔ اگرچہ درخت

کے پتوں کی طرح سب مذہب الگ الگ نظر آتے ہیں۔ مگر جڑ کو دیکھا جائے تو سب ایک ہی ہوتے ہیں۔ اتنا اگر ہم سمجھ سکیں تو دھرم کے نام پر جو لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اور ہو رہی ہیں۔ وہ بند ہو جائیں۔ ایسی لڑائیاں ہندو مسلمان کے درمیان ہی ہوتی ہیں۔ ایسا تھوڑا ہی ہے۔ ہندو دھرم میں کیا عیسائی دھرم میں کیا اور اسلام میں کیا۔ ایسی لڑائیوں کے بیان سے تاریخ کے صفحے کے صفحے بھرے پڑے ہیں۔

دھرم کی حفاظت۔ دھرم کے ماننے والوں کی پاکیزگی اور ان کے اچھے کاموں سے ہوتی ہے۔ غیر مذہب والوں کے ساتھ جھگڑنے سے نہیں۔

خانصاحب کا عدم تشدد

(خانصاحب سے مراد عبدالغفار خاں صاحب المعروف سرحدی گاندھی ساکن اتمان زئی تحصیل چارسدہ ضلع پشاور سے ہے)

مہاتما گاندھی جی تحریر فرماتے ہیں! جہاں بطرف شدہ اہنسا کی ہولی جل رہی ہے۔ وہاں خانصاحب کی جیتی جاگتی اہنسا قائم ہے۔ یہ بات ہمارے لئے چراغ جیسی روشن ہے۔ خانصاحب کا نو دن یاد رکھنے کے قابل ہے۔ خانصاحب کو موزوں بھی ایسا ہی ہے۔ خانصاحب پٹھان ہیں۔ پٹھان تو تلوار بندوق ساتھ لے کر

پیدا ہوئے ہیں۔ ایسے کہا جا سکتا ہے۔

رولٹ ایکٹ کی لڑائی کے زمانہ میں جب خدائی خدمتگار تیار ہوئے۔ تب خانصاحب نے اُن کے ہتھیار چھڑا دئے۔ سرکار کے ساتھ تو لڑنا ہی تھا۔ لیکن خانصاحب نے عدم تشدد کا سچا تجربہ دوسری جگہ پایا۔ پٹھانوں میں بدلہ لینے کا قانون ایسا سخت ہے۔ کہ اگر ایک خاندان میں خون ہوگیا ہو۔ تو اس کا بدلہ خون سے ہی لے کر چھٹکارا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ خون کا بدلہ لیا۔ تو پھر اس خون کا بدلہ بھی لینا ہوتا ہے۔ اس طرح پشت در پشت خون کا بدلہ خون سے لینے کا کہیں اختتام ہی نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی تشدد کی حد اور تشدد کا دیوالہ تھا۔ کیونکہ اس طرح خون کا بدلہ لیتے لیتے خاندان برباد ہوجاتے تھے۔ خانصاحب نے پٹھانوں کی ایسی بربادی دیکھی۔ اور عدم تشدد میں اُن کی بہتری پائی۔ انہوں نے سوچا کہ اگر میں پٹھان لوگوں کو سمجھا سکوں۔ کہ ہم کو نہ صرف خون کا بدلہ ہی نہیں لینا ہے۔ بلکہ خون کو بھول جانا ہے۔ تو ایک دوسرے سے بدلہ لینے کا سلسلہ بند ہو جائے گا۔ ہم زندہ رہ سکیں گے۔ اور زندگی کو کامیاب بھی بنا سکیں گے۔ یہ نقد کا سودا ہے۔ ان کے پیروکاروں نے اس پر عمل کیا۔ اب ایسے خدائی خدمتگار پائے جاتے ہیں۔ جو خون کا بدلہ لینا بھول گئے ہیں۔ یہ طاقتور کی اہنسا یا سچی اہنسا کہی جا سکتی ہے۔

اگر خانصاحب کانگرس میں رہتے تو ان کی زندگی کا کام خاک میں مل جاتا۔ وہ پٹھان سے کس منہ سے کہتے۔ کہ تم لڑائی میں تو بھرتی ہو جاؤ اور خون سے بدلہ لینے کا قانون رد سمجھو۔ ایسی بات پٹھان سمجھ ہی نہیں سکتے۔ وہ تو فوراً کہہ اُٹھتے۔ کہ جرمنی بھی تو اپنا بدلہ لے رہا ہے۔ انگریز مقابلہ کر رہا ہے۔ یہ ہار جائے گا۔ تو یہ بھی بدلا لینے کی تیاری میں لگ جائے گا۔ لہذا اس لڑائی اور ہمارے خون کا بدلہ خون سے لینے کے قانون میں رتی بھر بھی فرق نہیں ہے۔ ایسے دلائل کے سامنے خانصاحب کی زبان بند ہو جاتی۔ اس لیئے انہوں نے اپنا ہی کام جاری رکھنا پسند کر کے کانگرس سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ خانصاحب کو اہنسا کا پیغام پہچانے میں کہاں تک کامیابی ہوئی۔ وہ میں نہیں جانتا۔ اتنا ہی جانتا ہوں۔ کہ خانصاحب کا اعتقاد دماغی نہیں۔ بلکہ خالص دل سے نکلا ہوا ہے۔ اس لیئے وہ ہمیشہ قائم ہے۔ اب کب تک ان کے چیلے ان کی تعلیم میں لگے رہیں گے۔ یہ خود خانصاحب بھی نہیں کہہ سکتے۔ اور نہ اُس کی اُن کو پرواہ ہے۔ ان کو تو اپنا فرض پورا کرنا ہے۔ نتیجہ خدا پر چھوڑ دیا ہے۔ اُن کی اہنسا کی بنیاد قرآن شریف ہے۔ خانصاحب پکے مسلمان ہیں۔ وہ قریباً ایک سال تک میرے پاس رہے۔ باوجود بیمار ہونے کے انہوں نے کبھی نماز قضا کی نہ روزہ۔ خانصاحب کے دل میں دوسرے مذاہب کی پوری عزت ہے۔ انہوں نے گیتا کا

بھی تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ وہ ہمیشہ بہت کم پڑھتے ہیں۔ لیکن جو پڑھتے یا سنتے ہیں۔ وہ اگر عمل میں لانے کے قابل ہو تو اس پر عمل کرنے میں ان کو دیر نہیں لگتی۔ وہ لمبی چوڑی دلیلوں میں نہیں پڑتے۔ ذرا سمجھا اور فوراً ہاں یا نہ کہہ سکتے ہیں۔ اگر خانصاحب کو صاف کامیابی حاصل ہوئی۔ تو اس سے بہت ساری الجھنیں سلجھ سکتی ہیں۔ آج تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مٹی چاک پر چڑھی ہے۔ مٹکا اونیتر لگا یا گاگر۔ اس بات کو تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

ایک مسلمان بھائی کا مسئلہ

سوال:۔ ہم مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ کہ پیغمبرؐ صاحب کی زندگی پوری طرح خدا کی محبت سے بھری تھی۔ اور صحیح معنوں میں عدم تشدد پر مبنی تھی۔ اگرچہ عدم تشدد کا جو مطلب آپ لگاتے ہیں۔ اس میں نہیں۔ انہوں نے کبھی کسی پر حملہ کرنے کے لیے لڑائی نہیں کی۔ مگر جب وہ اپنی حفاظت کرنے کے لئے لڑائی پر مجبور ہو گئے تو انہوں نے مذہبی لڑائی کے لئے تلوار چلائی۔ انہوں نے خاص حالات میں خاص شرائط کے ماتحت تلوار کی اجازت دی ہے۔ مگر آپ کا عدم تشدد دوسری طرح کا ہے۔ آپ ہر حالت میں عدم تشدد سے کام لینے کو کہتے ہیں۔ لیکن مجھے

محسوس نہیں ہوتا۔ کہ پیغمبرؐ صاحب ایسا کرنے کی اجازت دیتے۔ تو پھر ہم کس کی تقلید کریں؟ آپ کی یا پیغمبرؐ صاحب کی؟ اگر ہم آپ کے پیچھے چلتے ہیں۔ تو ہم مسلمان نہیں رہتے ہیں۔ اگر پیغمبرؐ صاحب کے پیچھے چلتے ہیں۔ تو ہم کانگرس میں بھرتی نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ کانگرس آپ کے مکمل عدم تشدد میں اعتقاد رکھتی ہے۔ آپ کیا اس مسئلہ کو حل نہیں کریں گے؟

جواب:۔ میں یہی جواب دے سکتا ہوں۔ کہ جب تک آپ کو میرے کہنے اور پیغمبرؐ صاحب کے کہنے میں فرق معلوم دیتا ہے۔ آپ کو پیغمبرؐ صاحب کا ہی حکم ماننا چاہیئے۔ میرا نہیں۔ مگر میں اتنا کہتا ہوں۔ کہ میں نے بحیثیت ایک مختلف مذاہب کے مطالعہ کرنے والے کے پیغمبرؐ صاحب کی زندگی کا اور قرآن شریف کا مطالعہ کیا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں۔ کہ قرآن شریف سچے سچے عدم تشدد کا ہی سبق سکھلاتا ہے۔ قرآن شریف میں لکھا ہے کہ تشدد سے عدم تشدد اچھا ہے۔ عدم تشدد پر عمل کرنا آدمی کا دھرم ٹھہرایا گیا ہے۔ تشدد کے استعمال کی اجازت خاص ضرورت آن پڑے۔ اور کوئی دوسرا چارہ نہ ہو۔ اس حالت میں دی ہے۔ پیغمبر صاحب نے جو کیا۔ اس کا جج میں نہیں بن سکتا۔ مجھے اپنا طریق عمل اس کے مطابق بنانا ہے۔ جو بڑے بڑے پیغمبروں نے کہا ہے نہ کہ اُس کے مطابق جو انہوں نے کیا ہے۔ حضرت محمدؐ صاحب

اگر پیغمبرؐ تھے۔ تو اس وجہ سے نہیں۔ کہ انہوں نے تلوار کا جوہر دکھلایا تھا۔ بلکہ اس وجہ سے کہ برسوں تک انہوں نے صداقت کی تلاش میں خدا کی عبادت کی تھی۔ پیغمبرؐ صاحب کی زندگی کے یہ قیمتی سال نکال دیئے جائیں۔ تو پیغمبرؐ صاحب پیغمبرؐ نہیں رہتے ہیں۔ حضرت محمدؐ صاحب کو پیغمبر بنایا ہے تو ان کی زندگی کے اسی حصہ نے بنایا ہے۔ کسی بھی انسان کی زندگی ہمارے لئے تبھی تک رہنما بن سکتی ہے۔ جب تک کہ دنیا نے اس کو پیغمبر نہ ٹھہرایا ہو۔ پیغمبر ہی پیغمبر کے کاموں کے جج بن سکتے ہیں۔ جس طرح سے ایک معمولی شہری ایک سپاہی کی صفات اور نقائص کو اچھی طرح جان نہیں سکتا۔ سائنس کا علم نہ رکھنے والا انسان ایک سائنسدان کی خوبیوں وصفات کی جانچ نہیں کر سکتا۔ اسی طرح ایک معمولی انسان بھی پیغمبر صاحب نے جو کیا اس پر فیصلہ نہیں دے سکتا۔ ان کی تقلید کرنا تو درکنار۔ اگر آج میں موٹر چلانے بیٹھوں۔ تو اس میں شک نہیں۔ کہ میں اپنے آپ کو اور موٹر کو خطرے میں ڈال دوں۔ اور اغلب یہی ہے کہ موت کے منہ میں پہنچا دوں گا۔ تو ایک پیغمبر کی نقل کرنا میرے لئے کتنی خطرناک بات ہوگی؟ پیغمبرؐ صاحب سے کسی نے پوچھا تھا۔ کہ جب آپؐ قانون سے باہر روزے رکھ سکتے ہیں۔ تو آپؐ کے ساتھی کیوں نہیں؟ انہوں نے فوراً جواب دیا "خدا مجھے روحانی خوراک

پہنچاتا رہتا ہے۔ اس لئے میری جسمانی حاجت بھی پوری ہو جاتی ہے۔ آپ لوگوں کے لئے خدا نے رمضان بنایا ہے۔ آپ لوگ میری نقل نہیں کر سکتے" (میں یہ حوالہ اپنی یادداشت کی بنا پر دے رہا ہوں)

گری پروچن (Sermon on the mount)

سوال :- آپ اکثر حضرت عیسےٰ کے گری پروچن (Sermon on the mount) کا ذکر کرتے ہیں۔ کیا آپ اُس کے اس بیان کو تسلیم کرتے ہیں۔ کہ جو تمہارا کرتہ لینا چاہے۔ اُسے اپنا جامہ بھی دے دو؟ اگر ہے تو کیا آپ گاؤں کے غریب مسکین کاشتکاروں کو یہ صلاح دیں گے۔ کہ وہ اپنی آزاد زمین پر اپنے حقوق میں زمیندار کی دست اندازی اور زیادتیوں کو خوشی سے برداشت کریں؟

جواب :- ہاں میں بنا ہچکچاہٹ کے لگان دار کاشتکاروں کو صلاح دوں گا۔ کہ وہ ظالم کی زمین کو خالی کردیں۔ یہ تمہارا کرتہ مانگنے والے کو تمہارا جامہ بھی دے دیئے جیسی بات ہوگی۔ جس چیز کی ضرورت ہے۔ اُسے لینا تو فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ مل جائے۔ تو وہ عموماً ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ پیٹ بھرنا موت مول لینا ہے۔ زمیندار کو تو اپنا لگان چاہیئے

زمین نہیں۔ اس لئے جب وہ نہیں چاہتا تب اُس کی زمین خالی کردی جائے۔ تو وہ اُس کے سر آپڑے گی۔ جب آپ ایک ڈاکو جتنا مانگتا ہے۔ اس سے زیادہ اُس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ تو وہ حیران ہو جاتا ہے۔ اسے خواہ میٹھا سہی مگر اُسے دھکا سا لگتا ہے اس کے لئے یہ ایک نیا تجربہ ہوتا ہے۔ تاریخ میں ایسی مثالیں بھری پڑی ہیں۔ جہاں اس قسم کے عدم تشدد سے بُرے آدمی پر اچھا اثر پڑا ہے۔ مگر ایسے کام تب کئے جا سکتے ہیں۔ جب عدم تشدد میں مکمل اعتماد ہو۔ اور مقابلہ پر ڈٹنے والے کے لئے محبت اور رحم ہو۔ اتنا کہنا کافی ہے۔ کہ جو کچھ آپ نے بیان کیا ہے۔ اس میں حضرت عیسےٰؑ نے عدم تشدد کے ساتھ عدم تعاون کی ایک اچھی اور باأثر تصویر کھڑی کی ہے۔ جب آپ اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں۔ تو آپ کا عدم تعاون تشدد آمیز ہوتا ہے۔ اور آخر میں ناکارہ ثابت ہوتا ہے۔ مگر جب آپ جتنا کوئی مانگتا ہے۔ اتنا دینے کے بدلے سب کا سب اس کے آگے رکھ دیتے ہیں۔ تو آپ اس کے ساتھ غیر متشددانہ عدم تعاون کرتے ہیں۔ آپ کا بہ ظاہرہ تعاون جو در اصل مکمل عدم تعاون ہے۔ اُسے ایک دم بے ہتھیار کر دیتا ہے۔ کوئی آدمی کسی لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ بجائے اپنے زندہ جسم کے اپنی لاش اس کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ وہ آدمی اُس سے ہکا بکا رہ جاتا ہے۔

اور وہ لڑکی بہادروں کی موت مرتی ہے۔ نازک جسم کے اندر وہ شیر دل، کا ثبوت دیتی ہے۔

پاکستان اور غیر مسلم قومیں

سوال:۔ آپ نے "ہری جن" میں کہا ہے۔ کہ اگر آٹھ کروڑ مسلمان ہندوستان کے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ تو دنیا میں کوئی طاقت اِسے روک نہیں سکتی۔ آپ کو یہ کیوں محسوس نہیں ہوتا کہ پچیس کروڑ غیر مسلم اقوام کی رائے بھی اس بارے میں وقعت رکھتی ہے؟ آپ کا ایسی بات کہنے کا کیا یہ مطلب نہیں ہو جاتا۔ کہ آپ مسلمانوں کی رائے کو خوب بڑھا کر وقعت دیتے ہیں۔ اور غیر مسلمانوں کی رائے کی آپ کے نزدیک کچھ وقعت ہی نہیں ہے؟

جواب:۔ میں نے تو اپنی رائے ظاہر کر دی ہے۔ اگر ہندو عیسائی، سکھ، یا چھوٹی سی پارسی قوم کی رائے کو بھی شامل کر کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کے باقاعدہ چنے ہوئے نمائندوں کی خواہش کی سخت مخالفت کرے۔ تو انہیں خانہ جنگی کی ذمہ داری سر پر لیکر ہی ایسا کرنا ہوگا۔ اور اگر ہم نے اپنے مسئلوں کو عدم تشدد کے ذریعہ حل کرنا ہے۔ تو ہمارے سامنے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میں یہ اس لئے نہیں کہتا۔ کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کی بات ہے۔ اگر یہ آٹھ

گروڑ کسی دوسری قوم کے ہوتے تو بھی میری یہی رائے ہوتی۔

وکالت کا پیشہ اور ستیاگرہ

سوال:- آپ جانتے ہیں۔ کہ ہمارے ملک کے وکالت کے پیشہ میں جھوٹ اور دھوکا بازی اندھا دھند چلتی ہے۔ ایسی حالت میں کیا آپ وکالت کا دھندا کرنے والوں کو ستیاگرہی کے طور پر بھرتی ہونے کی اجازت دیں گے؟

جواب:- میں آپ کے اس سب کو ایک ہی لپیٹ میں لانے والے خیال سے متفق نہیں ہوں۔ اگر ایک وکیل ستیاگرہی بننا چاہتا ہے۔ تو یہ سمجھنا چاہیئے۔ کہ ایک حد تک اس میں شدھی ہے۔ اس میں شک نہیں۔ کہ کانگرس میں کچھ دھوکا باز لوگ بھی ہو سکتے ہیں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ ہیں۔ لیکن ایک اتنی بڑی انجمن میں ایسا ہونا ضروری ہے۔ مگر ایک آدمی کو اس کے دھندے کے باعث ناقابل قرار دینا کسی ستیاگرہی کے لئے موزوں نہیں ہے۔

ستیاگرہ اور ارادتاً مخالفت

سوال:- کیا ارادتاً مخالفت کرنے کا طریقہ ستیاگرہ کے خلاف نہیں ہے۔ ستیاگرہ تو اصولوں کے لئے کھڑا ہونا ہے۔ فرقہ بندی کے لئے نہیں۔ ایک ہی قوم اپنی پارٹی بنانا چاہے۔ تو اُس کا

ساتھ دینا اور مخالف فریق وہی قدم اٹھائے تو اُس کی مخالفت کرنا۔ اس اصول کو آپ پسند کرتے ہیں ؟ آج کل میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں کچھ کانگرس وادی یہی طریق چلا رہے ہیں ؟

جواب: میں نے ایسی حرکتیں کرنے کے طریق کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔ کانگرسیوں کے لیئے موزوں یہی ہے۔ کہ مخالفین کی اکثریت کے اچھے کاموں میں ہمیشہ تعاون سے کام لینا۔ بڑائی کی خاطر طاقت حاصل کرنے کا کانگرس کا کبھی بھی مقصد نہیں ہونا چاہیئے۔ سچا تعاون کانگرس کی عزت بڑھائے گا۔ کانگرس میں مزید رائے بھی لا سکتا ہے۔

پانچ سوالات

سوال (۱) کیا گرفتار ہونے پر ستیاگرہی یعنی وہ جنہوں نے ستیا گرہ کے اقرار نامہ پر دستخط کیئے ہیں۔ اپنا بچاؤ (Defence) کر سکتے ہیں ؟

سوال (۲) کیا ستیاگرہی اچھے درجہ یعنی بی یا اے کلاس کی سہولتوں کے حصول کے لیئے کوشش کر سکتا ہے ؟

سوال (۳) ستیاگرہی کو اپنے اوپر جیل لادی گئی حالت کے سامنے سر جھکا دینا چاہیئے ؟ یا جسے وہ زیادہ انسانیت اور تسلی بخش

سلوک خیال کرتا ہو۔ اُسے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے؟

سوال (۴) ایک ستیاگرہی کو کم از کم کتنی دیر کاتنا چاہیئے۔ یا کم سے کم کتنا سُوت کاتنا چاہیئے؟

سوال (۵) کیا آپ کے ذریعہ ستیاگرہ کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی کوئی آدمی ستیاگرہ کے اقرار نامہ پر دستخط کرکے گرفتار ہو سکتا ہے۔ یا ستیاگرہ کی تحریک میں حصہ لینے کے لئے قابلیت کی کوئی ایسی معیاد مقرر ہے۔ جس میں اس کا ستیاگرہی رہنا ضروری ہو؟۔

جواب (۱):- صفائی دینے اور بچاؤ کرنے میں کوئی اعتراض نہیں نہیں ہے۔ بلکہ کچھ معاملوں میں تو جیسے اجمیر والا معاملہ ہے ایسا کرنا فرض ہے۔

جواب (۲) میری رائے میں اپنی کلاس یعنی جماعت بدلوانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیئے۔ ذاتی طور سے میں کسی قسم کے درجہ کی تقسیم کے خلاف ہوں۔

جواب (۳) اُسے اختیار ہے۔ کہ انسانیت کے حالات پیدا کرنے کے لئے ہر طرح کی موزوں کوشش کرے۔

جواب (۴)، میں سمجھتا ہوں۔ کہ کم از کم ایک گھنٹہ روز کاتنا چاہیئے۔ اور ۳۰۰ تار فی گھنٹہ کی رفتار ٹھیک ہے۔ زیادہ مشغول آدمی کم بھی کات سکتے ہیں۔

جواب (۵) شرائط کو پورا کرنے سے بچنے کے لئے جو آدمی جان بوجھ کر اقرار نامہ پر دستخط کرنے سے بھاگتا ہے۔ وہ چور ہے اور ستیاگرہی بننے کے قابل نہیں۔ لیکن میں ایک ایسے ایماندار آدمی کا بھی تصور کر سکتا ہوں۔ جو اقرار نامہ پر دستخط کر کے سیدھا چیل جا سکتا ہے۔ آئندہ قول کرنے والوں یا جو قول کر چکے ہیں۔ ان کو کھونے کا خطرہ اٹھا کر بھی میں کہوں گا۔ کہ میرے ستیاگرہ کا آواہن کرنے کی جلدی کوئی امید نہیں ہے۔

ڈنڈا ایپہ

سوال :- میں ایک استاد ہوں۔ سکول کے لڑکوں اور اپنے بچوں کے ساتھ برتاؤ میں آپ کے عدم تشدد کے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ سکول کے لڑکوں کے ساتھ مجھے کافی کامیابی بھی ملی ہے۔ صرف ایک ہی بد معاش لڑکا ہے۔ جسے میں ٹھیک نہ کر سکا۔ اُسے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس بھیجدوں گا۔ لیکن میرے اپنے بچوں کو اکثر میری پیٹنے کی خواہش ہو آتی ہے۔ حالانکہ میں اُسے دبا لیتا ہوں۔ میرے ایک چچا میرے خیال کے نہیں ہیں۔ وہ اس پورانی کہاوت کے اوپر عمل کرنے والے ہیں۔ کہ

"لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے"

بغیر ڈنڈے کے بچے بگڑ جاتے ہیں۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ بچے بھی ابھی

کی مانتے ہیں۔ مجھے اپنے بچوں کے ساتھ کیسے چلنا چاہیئے؟ ایک عدم تشدد پر عمل کرنے والا استاد ایک بدمعاش لڑکے کے ساتھ کیسا سلوک کرے؟

جواب:۔ مجھے تو یہ صاف محسوس ہوتا ہے۔ کہ آپ کو اپنے بچوں کو اور شاگردوں کو جسمانی یا کسی دوسرے قسم کی سزا نہیں دینی چاہیئے۔ اگر آپ چاہیں۔ اور آپ میں قابلیت ہو۔ تو اپنے بچوں اور شاگردوں کا دل پگھلانے کے لئے آپ اپنے آپ کو سزا دے سکتے ہیں۔ بہت سی ماتاؤں نے اپنے لڑکوں کو اس طرح سدھارا ہے۔ میں نے خود بہت بار ایسا کیا ہے۔ جنوبی افریقہ میں بہت بار میرا واسطہ جنگلی لڑکوں سے پڑا تھا۔ ان میں ہندو۔ عیسائی۔ مسلمان۔ پارسی سبھی تھے۔ سوائے ایک کے مجھے یاد نہیں۔ کہ میں نے کبھی کسی کو سزا دی ہو۔ میرا عدم تشدد ہمیشہ ہی کامیاب رہا۔ جب استاد اور شاگرد میں محبت کی گانٹھ بندھ جاتی ہے۔ شاگرد کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ کہ ان کے باعث استاد تکلیف اٹھائے رہی بدمعاش لڑکے کی عادت۔ اگر اس کے من میں آپ کی عزت نہیں ہے۔ تو اُس کے ساتھ عدم تعاون کیجیئے۔ یعنی اسے اپنے سکول سے نکال دیجئے۔ عدم تشدد آپ کو مجبور نہیں کرتا۔ کہ آپ ایسے لڑکے کو سکول میں ہی رکھیں۔ جو اسکول کے قواعد پر عمل نہیں کرتا۔

لازمی دعا

سوال:- میں اکھل بھارت چرخہ سنگ کی راجستھان برانچ کا ایک کارکن ہوں۔ میں خود تو دعا میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ مگر میرے کچھ ساتھی نہیں رکھتے۔ لیکن انجمن کے قاعدوں کے مطابق انہیں دعا میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ انہیں ڈر ہے۔ کہ اگر وہ ایسا نہ کرینگے۔ تو انہیں اپنی نوکری سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ میرے خیال میں انجمن انہیں آٹھ گھنٹے روز کام کرنے کے لئے تنخواہ دیتی ہے اُسے کیا حق ہے کہ وہ کارکنان کو دعا میں شامل ہونے پر اصرار کرے؟

جواب:- دعا لازمی ہو ہی نہیں سکتی۔ دعا تب ہی دعا ہے جب وہ اپنے آپ دل سے نکلتی ہے۔ مگر آج کل لوگ لازمی کے عجیب معنے نکالتے ہیں۔ اگر آپ کی انجمن کا قانون ہے۔ کہ وہاں رہنے والا ہر شخص خواہ تنخواہ لے کر یا بغیر تنخواہ کے کام کرتا ہے۔ عبادت میں آنا ہی کا ہے۔ تو میری رائے میں آپ کو بھی دوسرے فرائض بجالانے کی طرح عبادت میں بھی حصہ لینا ہی ہوگا۔ آپ اپنی مرضی سے انجمن میں داخل ہوئے تھے۔ آپ کو انجمن کے قوانین کا علم تھا۔ یا کم سے کم پتہ ہونا چاہیئے تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جیسے انجمن میں داخل ہونے کے بعد آپ اپنے اور سب کام اپنی خوشی سے کرتے ہیں۔ ویسے

ہی عبادت میں بھی خوشی سے حصہ لیتے ہیں۔ اگر آپ صرف تنخواہ کی خاطر ہی انجمن میں داخل ہوئے تھے۔ تو آپ کو مینیجر صاحب کے سامنے یہ صاف کہہ دینا چاہیئے تھا۔ کہ آپ عبادت میں نہیں آ سکتے اگر اپنے دل میں عبادت کے لئے مخالفت رکھ کر آپ بغیر اس مخالفت کو ظاہر کئے داخل ہوئے۔ تو آپ نے غلطی کی ہے۔ اس غلطی کا آپ کو افسوس کرنا ہوگا۔ یہ دو طرح سے ہو سکتا ہے۔ یا تو آپ دل سے عبادت میں حصہ لیں یا استعفےٰ دیدیں۔ اور آپ کے ایک دم استعفیٰ دینے سے انجمن کو جو نقصان ہوتا ہے۔ اسے بھریں۔ انجمن میں داخل ہونے پر ہر ایک شخص کا یہ فرض ہو جاتا ہے۔ کہ جو قانون انجمن کے مینیجر وقت پر بناتے ہیں۔ ان پر چلیں۔ اگر کوئی نیا قانون کسی کو کھٹکتا ہے۔ تو وہ استعفےٰ دینے کے قواعد کے مطابق استعفےٰ دے کر انجمن سے الگ ہو سکتے ہیں۔ مگر جب تک اس انجمن میں ہیں۔ تب تک انجمن کے قواعد سے انکار نہیں کر سکتے۔

ایک ودھوا کی مشکلات

سوال:- میں ایک بنگالی برہمن ودھوا ہوں۔ اپنے رنڈاپے کے دن سے ان چوبیس ۲۴ سالوں میں میں اپنے کھانے کے بارے میں سخت اصولوں پر پابند رہنے کی عادی ہوں۔ اپنے ہی خاندان کے اندر بھی مجھ بیوہ کا علیحدہ ہی چوکا ہے۔ اور برتن بھی میرے الگ

ہیں۔ میں آپ کے سینہ اور اہنسا کے اصولوں میں اعتقاد رکھتی ہوں۔ ۱۹۳۰ء سے میں عادتاً کھدر پہنتی ہوں۔ اور باقاعدہ کاتتی ہوں۔ ڈھاکہ کے ایک ہریجن دیہات میں ہمارے مہیلا سماج نے ایک ہریجن سکول کھول رکھا ہے۔ میں وہاں جاتی اور ہریجنوں میں شریک ہوتی ہوں۔ میں اپنی مسلمان بہنوں سے بھی کھلے طور پر ملتی جلتی ہوں۔ جن کے لئے میرے دل میں نیک خواہشات ہیں۔ لیکن میں ہریجنوں یا دیگر غیر براہمن جاتیوں کے ساتھ کھا پی نہیں سکتی۔ کیا میری جیسی کٹر ودھوائیں ستیا گرہیوں میں بھرتی نہیں ہو سکتیں؟

جواب:۔ کانگرس قوانین کے مطابق تم کو بھرتی ہونے کا پورا حق ہے۔ تم اپنے حق پر عمل بھی کرا سکتی ہو۔ لیکن جب تم مجھے پوچھتی ہو۔ تو میں تمہیں بھرتی ہونے سے منع کروں گا۔ میں جانتا ہوں کہ بنگالی ودھوائیں کتنی باریکی سے ان قواعد پر عمل کرتی ہیں۔ جنہیں کہ رسم و رواج نے ان کے لئے قائم کر رکھا ہے۔ لیکن جن ودھواؤں نے اپنے آپ کو ملکی کام کے لئے پیش کر دیا ہے۔ اور وہ بھی عدم تشدد کے طریق سے انہیں کسی کے ساتھ کھانے پینے میں کوئی پرہیز نہ ہونا چاہئے۔ میرا اس بات میں اعتقاد نہیں ہے۔ کہ لوگوں کے ساتھ کھانے سے پھر خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو روحانی ترقی میں کوئی رکاوٹ ہوتی ہے۔ خاص چیز تو دل کے خیالات ہیں۔ اگر کوئی ودھوا ہر ایک کام خدمت کے خیال سے کرتی ہے۔ تو اس کا بھلا ہی ہوگا۔ کوئی

ودھوا کھان پان اور دیگر قواعد بڑی باقاعدگی سے عمل کرتی ہے۔ پھر بھی اگر وہ صاف دل نہیں۔ تو وہ سچی ودھوا نہیں ہے۔ اُسے تم بھی جانتی ہو اور میں بھی جانتا ہوں۔ کہ سماج کو قابو میں رکھنے کے لئے جو قواعد ہوتے ہیں۔ ان کا ظاہرہ طور پر عمل کر کے کتنے ہی پاکھنڈی اپنے کو چھپا لیتے ہیں۔ اس لئے میں تمہیں مشورہ دوں گا۔ کہ کھانے پینے کے متعلق اور ایسی ہی دیگر باتوں میں جو مشکلات ہیں۔ انہیں روکاوٹ سمجھ کر ان کی پرسواہ نہ کرو۔ سبتہ گرہ دل میں ہیں ان کو ہی لینا پسند کروں گا۔ جنہوں نے کہ اپنی عقل سے کام لیا ہے۔ اور زندگی کا ایک ایسا راستہ چن لیا ہے۔ جو ان کے دل و دماغ دونوں کو ہی فائدہ مند معلوم ہوا ہے۔

جھوٹ کا مقابلہ کیسے کیا جائے؟

سوال:۔ جب آپ برطانیہ اور فرانس کے ساتھ ان کی اپنی زندگی کے لئے ہمدردی دکھاتے ہیں۔ تو لوگ آپ کی سچائی میں اعتقاد رکھتے ہیں۔ لیکن ہم میں سے کچھ کو اس خطرے کی بو آتی ہے جو ہندوستانی سرمایہ دار جو اس جنگ کی وجہ سے بھاری منافع اٹھا رہے ہیں۔ وہ ہندوستان میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے آپ کو واحد ذریعہ بنائے رکھیں گے۔ اس شک کو رفع کرنے کے لئے آپ کیا قدم اٹھا رہے ہیں؟

جواب:۔ میں نہ کوئی بھی قدم نہیں اٹھانا چاہتا۔ جیسا کہ میں نے اس وقت بھی کچھ نہیں کیا تھا۔ جب مجھ پر اس بات کا الزام لگایا گیا تھا۔ کہ بنک آف انگلینڈ میں میرے ایک کروڑ روپیہ جمع ہیں سب سے اچھا تو یہی ہے۔ کہ جھوٹ کا کوئی جواب ہی نہ دیا جائے۔ جھوٹ اپنی موت مر جاتا ہے۔۔ اس کی اپنی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ مخالفت پر وہ پھلتا پھولتا ہے۔ آپ نے جس جھوٹ کا ذکر کیا ہے اگر اس کے لئے میری ساری زندگی ہی ٹھیک جواب نہیں ہے۔ تو کوئی بھی تجویز نہیں کر دوں۔ اس سے وہ چھاپ دور نہیں ہو سکتی جو اس جھوٹ کی وجہ سے لگی ہے۔ دھیان رہے کہ میں اس بات پر جھگڑنا نہیں چاہتا۔ کہ میری خاموشی سے جو پُرامن کرہ ہوائی پیدا ہوا ہے۔ وہ بہ نسبت سرمایہ داروں کے عوام کے لئے زیادہ مفید ہے۔ کیونکہ اس خاموشی سے ان میں اپنی عدم تشدد کی طاقتوں کو جمع کرنے کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے وہ سرمایہ داری اور امپیریلزم کا جو انہیں دبائے ہوئے ہیں۔ مؤثر طور پر مقابلہ کر سکیں گے۔

ہریجن رسوئے

سوال:۔ آپ کو کیا یہ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ کہ اگر کانگریس ہزارہا گھروں کے لئے ہریجن۔ رسوئے تیار کرنے کی تجویز نکالے اور

یہ قاعدہ بنا دے۔ کہ کانگرس والوں کے ہر ایک آشرم اور رفاہ عامہ کے رسوئی گھروں میں ہریجن رسوئیے ہی کام کریں گے۔ تو چھوا چھوت دور کرنے میں بہت جلدی مدد مل سکتی ہے؛

جواب:۔ ہمارا مقصد تو یہ ہے۔ کہ ہریجن اونچے سے اونچے درجہ پر پہنچ سکیں۔ مگر یہ مقصد ہوتے ہوئے بھی اچھے ہریجن رسوئیے تیار کرنا ایک اچھی بات ہے۔ میں نے دیکھا ہے۔ کہ جتنا ہم ہریجنوں کو اپنے گھر کے دائرہ میں کھینچتے ہیں۔ اتنا ہی سدھار کا کام آگے بڑھتا ہے۔ جو ہریجن ہمارے گھروں میں گھل مل جاتے ہیں۔ وہ نیچے پن کے خیالات سے نجات پا لیتے ہیں۔ اور ہریجنوں اور ذات دار ہندوؤں کے درمیان ایک شہتیر بن جاتے ہیں۔

اگر آپ باہمت ہیں

سوال:۔ پچھلے مہینے میری ماں مر گئی۔ ایک عرصہ سے میں ہریجنوں کے ذریعہ پکایا گیا کھانا کھانے کا عادی تھا۔ کٹر لوگ اسے پسند تو نہیں کرتے تھے لیکن وہ میرے اس کام کو برداشت کرتے رہے۔ تین سال پہلے کی بات ہے کہ ایک مسلمان دوست نے اپنی ماں کی وفات پر مجھے دعوت دی اور میں نے اس میں شامل ہونے کی منظوری دیدی۔ اب میری ماں کی وفات ہو گئی ہے۔ میری ذات والوں نے میری ماں کی آخری رسوم کے متعلق سب کاموں میں شامل ہونے سے

انکار کر دیا ہے مجھے کیا کرنا چاہیئے؟

جواب :- اگر آپ باہمت ہیں۔ تو آپ کو اپنی ذات والوں کو جو کچھ برا سے برا وہ کرنا چاہیں۔ کرنے دینا چاہیئے۔ لیکن آپ کو ہر طرح کی قیمت دے کر بھی اپنے مسلمان دوست کی دوستی قائم رکھنی چاہیئے۔ اور جتنی بار ضرورت پڑے۔ اس کے ساتھ کھانا کھانا چاہیئے۔ ایسی مخالفت کی ذرا بھی پرواہ نہ کرنی چاہیئے۔

ایک ہندو کی ہریجن لڑکی سے شادی

اڑیسہ میں ایک ہندو اور ہریجن لڑکی کے درمیان شادی ہونے کے بارے میں شری ہری کرشن مہتاب تحریر فرماتے ہیں :-

" اڑیسہ میں کھُروا کے رہنے والے شری رادھا مادھو مترا اڑیسہ سرکار کے محکمہ آبکاری میں سب انسپکٹر ہیں۔ انہوں نے پچھلی ۴ مارچ کو پھول رانی نام کی ایک ہریجن لڑکی سے شادی کی ہے۔ اور یہ شادی ہندو رسم و رواج کے مطابق ایک ہریجن سے کروائی گئی۔ تمام ذاتوں کے لوگ اس میں شامل ہوئے۔ جو ایک ہزار کے قریب تھے۔ رادھا مادھو تقریباً ۲۵ سال کے ہیں۔ جب وہ کھُردا سکول میں پڑھتے تھے۔ تب انہوں نے ہریجن لڑکوں کی ایک فٹ بال کی ٹیم بنائی تھی۔ اور اس وقت آپ نے ہریجنوں کے لئے برت لیا تھا۔ تب رادھا مادھو اپنے چند دوستوں کے ساتھ ایک ہریجن گاؤں میں رہا کرتے تھے۔ اسی

عرصہ میں انہوں نے اور اُن کے دوستوں نے وعدے کئے تھے۔ کہ ہریجن لڑکیوں سے شادی کریں گے۔ ان کے دوست اپنے وعدے کو بھول گئے۔ مگر انہوں نے اپنا قول پورا کیا۔ پہلے پہل جب ہریجن لڑکی سے شادی کرنے کی بات چلی۔ تو ان کے رشتہ دار اور دوست ان کو ایسا نہ کرنے کے لئے دبانے لگے۔

جب انہوں نے مجھسے مشورہ کیا تو میں نے ان کے سامنے مستقبل کی تاریک تصویر رکھ دی۔ لیکن ان سب کی کچھ بھی پرواہ نہ کرتے ہوئے وہ اپنے ارادہ پر جمے رہے۔ اور ارادہ پورا کیا۔ دلہن کے رشتہ داروں نے بھی مخالفت کی۔ لیکن بعد میں رضامند ہو گئے۔ رادھا مادھو جی نے پانصد روپیہ کا دستاویز اس لئے کہ وہ کسی وقت اپنی عورت سے تعلق قطع کریں۔ تو ہرجانہ دینا ہو گا۔ رجسٹری کرایا۔ ہم نے بڑے بڑے لوگوں کو اس میں شامل ہونے کی حتی الوسع کوشش کی۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ ہم جو کچھ چاہتے تھے۔ اس میں کامیاب ہوئے۔ پان جاتی والے شادی کی رسم کے وقت سات سو کے قریب موجود تھے۔ اور ان کے ساتھ دیگر جاتیوں کے بھی بڑے بڑے آدمی تھے۔ ان سب کے چہرے بشاش معلوم ہوتے تھے۔ دلہن کے والد سب کو پان نذر کر رہے تھے۔

گاندھی جی:۔ میں شری رادھا مادھو جی کو اس کی بہادری کے لئے مبارک باد دیتا ہوں۔ کہ انہوں نے ذات پات کی ایک سخت

چٹان کو توڑا۔ مجھے امید ہے کہ یہ مثال دیگر لوگوں کے لئے بھی بڑی فائدہ مند ثابت ہو گی۔ اور نوجوان اس کی تقلید کریں گے۔

خدا جوڑے کو خوش و خرم رکھے۔ میں شری مادھو جی کو صلاح دونگا کہ وہ اپنی عورت کی تعلیم کا کوئی اچھا انتظام کریں۔ کیونکہ میرا خیال ہے۔ کہ وہ تعلیم یافتہ نہ ہو گی۔

سارا فالتو وقت

سوال:۔ آپ کہتے ہیں۔ ستیاگرہی کو اپنا سارا فالتو وقت عملی کام میں صرف کرنا چاہئے۔ تب فالتو وقت سے آپ کی مراد کیا ہے؟

جواب:۔ ہر ایک لمحہ جس کی مجھے اپنے ضروری ذاتی کام کے لئے ضرورت نہیں ہے۔ فالتو وقت ہے۔ ایک نجار کے پاس جس کا سارا وقت دولت کمانے میں لگتا ہے۔ اور اس میں درحقیقت کوئی دوش نہیں ہے اگر پیسہ ایمانداری سے کمایا جائے۔ اسی طرح ایمانداری کے ساتھ خرچ بھی کیا جائے۔ تو واقعی کوئی فالتو وقت نہیں ہے۔ وہ ستیاگرہی نہیں بن سکتا۔ ایک ستیاگرہی اپنے نجی کام کے لئے کم سے کم وقت دیگا۔ باقی سب اس کے لئے فالتو ہی وقت ہے۔ ستیاگرہی کے لئے وقت دولت سے زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے اسے اپنے ہر ایک لمحہ کا ٹھیک ٹھیک حساب دینے کے قابل ہونا چاہیئے۔ ایسے معاملوں میں تو فیصلہ دینے

والا انسان خود ہی ہوتا ہے۔

رخصتوں کا استعمال کیسے کیا جائے

سوال :۔ رخصتوں کے دنوں میں طلبا کیا کر سکتے ہیں؟ وہ مطالعہ کرنا نہیں چاہتے۔ اور لگاتار کاتنے سے تو تھک جائیں گے؟

جواب :۔ اگر وہ کاتنے سے تھک جاتے ہیں۔ تو اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انہوں نے اس کی زندگی دینے والی طاقت اور اندرونی کشش کو نہیں سمجھا ہے۔ اُسے سمجھنے میں کیا دقت ہے کہ کاتا ہوا ایک گز سوت قوم کی دولت کو بڑھاتا ہے۔ ایک گز سوت یوں کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔ چونکہ محنت کا سب سے آسان طریقہ ہے۔ اس لئے اسے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس طرح کاتنے کی قیمت بہت زیادہ ہے۔ طلبہ سے چرخہ کو اچھی طرح سمجھنے اور اسے اچھی حالت میں رکھنے کی امید کی جا سکتی ہے۔ جو ایسا کرتے ہیں انہیں کاتنے میں ایک عجیب کشش کا تجربہ ہوگا۔ اس لئے میں کوئی دوسرا کام بتانے سے انکار کرتا ہوں۔ ہاں کتائی کی جگہ کوئی دوسرا زیادہ ضروری کام لے سکتا ہے۔ زیادہ ضروری سے میرا مطلب وقت کے نقطہ نگاہ سے ضروری ہے۔ گرد و نواح کے دیہاتوں کو اچھی صاف ستھری اور صحت بخش حالت میں رکھنے۔ بیماروں کی تیمارداری کرنے یا ہریجن بچوں کو تعلیم دینے وغیرہ کاموں میں ان کی مدد کی

ضرورت ہو سکتی ہے۔

ایک مجلسی گندگی

سوال :- فقیروں کی حالت نے سب جگہ خاص کر شہروں میں ایک مجلسی گندگی کی شکل اختیار کر لی ہے ہندوستان کے لئے ان کاہلوں کی فوج کا بوجھ اٹھانا مشکل ہے۔ ہمارے سیدھے سادے لوگوں کے خوف اور ہمدردی کا فائدہ اٹھانے اور ان سے بھیک مانگنے کے خیال سے یہ اذیت اور کبھی کبھی دھمکیوں سے کام لیتے ہیں۔ اسی طرح ان میں سے بہت سے ایسے ہیں۔ جنہوں نے خفیہ طور سے کافی پیسہ جمع کر لیا ہے۔ اور یہ پاپ اور بدکرداری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے آپ کیا طریقہ تبلائیں گے ؟

جواب :- بھیک مانگنے کا رواج ہندوستان میں پورانے زمانہ سے چلا آرہا ہے۔ ہمیشہ ہی یہ پیشہ کی صورت میں نہیں رہا ہے ہاں اب ضرور اس نے پیشہ کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جیسے ٹھگوں بدمعاشوں نے قبول کیا ہے۔ کام کر کے اپنی روزی کمکھا لے کے قابل کسی بھی آدمی کو بھیک مانگنے نہیں دیا جانا چاہیے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کا طریقہ یہ ہے۔ کہ جو لوگ پیشہ ور بھکاریوں کو بھیک دیتے ہیں۔ انہیں سزا دی جانی چاہیئے۔ اور کام کرنے کے لائق بھکاریوں

کو سزا وار قرار دے دینا چاہیئے۔ لیکن یہ سدھار تب ہی ہو سکتا ہے۔ جب یہ میونسپلٹیاں ایسے کارخانوں کو جاری کریں۔ جہاں لوگوں سے کام لے کر کھانا دیا جائے۔ اس طرح کے کام میں مکتی فوج والے مخصوص ہیں یا تھے۔ انہوں نے لندن میں دیا سلائی کا ایک کارخانہ کھولا تھا۔ جس میں جانے والے ہر ایک آدمی کو کام اور کھانا ملتا تھا۔ میں نے جو کچھ بتایا ہے۔ وہ تو بیماری کا ایک فوری علاج کرنے کی دوا ہے۔ سچا علاج تو اس کے اصلی وجوہات کی کھوج نکالنے اور اس کو حل کرنے میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی مالی حالت میں یکسانیت کی جائے۔ موجودہ وقت میں جب کہ مالی مساوات کا رواج نہیں ہے۔ اس کا مجلسی خرابی کے طور پر انسداد کرنا چاہیئے۔ کسی اچھے سماج کے اندر چند آدمیوں میں دھن کا جمع ہو جانا اور لاکھوں کا بیکار ہونا ایک بڑا بھاری مجلسی جرم یا بیماری ہے۔ جس کا علاج ضروری ہونا چاہیئے۔

طلباء کی مشکلات

سوال:۔ ہم پونا کے طالب علم ہیں۔ اور ناخواندگی دور کرنے کے کام میں حصہ لے رہے ہیں۔ جن حصوں میں ہم جاتے ہیں وہاں بہت شرابی رہتے ہیں۔ جو لوگوں کو پڑھائے جانے پر ہم کو دھمکی دیتے ہیں۔ ہم ہریجنوں کے بیچ میں کام کر رہے ہیں۔ وہ ڈر جاتے ہیں

چند لوگ کہتے ہیں۔ کہ ان شرابیوں کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہیئے۔ بعض کہتے ہیں۔ کہ ان کو فتح کرنے کے لئے آپ کے طریقہ کی نقل کرنی چاہیئے۔ کیا آپ کچھ صلاح دیں گے؟

جواب:۔ آپ لوگ اچھا کام کر رہے ہیں۔ ناخواندگی دور کرنا۔ یا اس طرح کے بہتر کام اس زمانہ کے بڑے سے بڑے کام کے اصلاحی جزو ہیں۔ جہاں تک شرابیوں کی بات ہے۔ ان کے ساتھ بیمار آدمیوں کی طرح کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ جو ہماری ہمدردی اور خدمت کے مستحق ہیں۔ اس لئے جب وہ سنجیدگی میں ہوں تب انہیں سمجھانا چاہیئے۔ اور وہ ماریں پیٹیں تو اسے بھی برداشت کرنا چاہیئے۔ میں قانونی کارروائی کو منع نہیں کرتا۔ لیکن ویسا کرنا اس بات کا ثبوت ہوگا۔ کہ آپ میں پوری طرح اہنسا نہیں ہے۔ لیکن آپ اپنی عادت کے خلاف نہیں جا سکتے۔ اگر عاجزی سے سمجھانے سے بھی ان کے رویہ میں تبدیلی نہیں آتی۔ تو بھی آپ کا کام بند نہیں ہونا چاہیئے۔ ایسی حالت میں قانونی کارروائی کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ لیکن قانون کی مدد لینے سے پہلے آپ لوگوں کو سچائی کے ساتھ سب طرح سے کوشش کرکے دیکھ لینا چاہیئے۔

اہالیان برطانیہ کیا کریں کیا نہ کریں

سوال :- اہالیان برطانیہ کے نام اپنے مضمون میں اپنے لکھا ہے۔ "اپنی روح کا قبضہ نہ دینا۔ اپنے دل کا قبضہ نہ دینا۔ ان کی ماتحتی کو قبول نہ کرنا۔" برطانوی لوگ کیا کریں ؛ یہ بتلا کر کیا آپ اپنے مضمون کا مطلب نہ سمجھائیں گے ؛ آپ کا یہ مضمون تو ستیاگرہیوں پر بھی لاگو ہوتا ہے ؛

جواب :- روح کا قبضہ نہ دینا۔ یعنی جس بات کو آپ کا دل نہ مانے وہ نہ کرنا۔ مثلاً دشمن آپ کو کہتا ہے۔ "کان پکڑو۔ ناک رگڑو۔ اٹھو بیٹھو۔" آپ ان میں سے کچھ بھی نہ کریں۔ وہ اگر آپ کا گھر بار لوٹتا ہے۔ تو لوٹنے دیں۔ گھر کا تعلق تو آپ کی روح سے اسی وقت ٹوٹ گیا۔ جب آپ عدم تشدد کے پجاری بن گئے۔ اس میں آپ کا قبضہ اتنا ہی رہ سکتا ہے۔ جتنا کہ دنیا با آسانی آپ کے پاس رہنے دے۔

"من کا قبضہ نہ دینا" سے مراد ہے۔ کہ آپ کبھی لالچ میں نہ آئیں۔ انسان کا دل اس قدر کمزور ہے۔ کہ کوئی اگر میٹھی میٹھی باتیں کرے اور کچھ لالچ دیوے۔ تو وہ اس میں پھنس ہی جاتا ہے۔ ایسے تجربات ہم کاروبار عالم میں ہر روز ہی کرتے ہیں۔ ہلکے دل کا آدمی ستیاگرہی نہیں بن سکتا۔ اس کی نہ ہمیشہ کے لئے ہاں اور ہاں ہمیشہ

کے لئے ہاں رہنی چاہئے۔ ایسا کرنے والا آدمی ہی ستیہ پر قائم رہ سکتا ہے۔ عدم تشدد پر بھی وہی کار بند رہ سکتا ہے۔

ضد اور پختگی کا فرق یہاں سمجھ لینا چاہئے۔ عقل اگر اپنی غلطی کو تسلیم کرے۔ پھر بھی اس لئے اپنی بات پر اڑے رہنا کہ اس کی زبان سے ایک بار نکل چکی ہے "ضد" کہلاتی ہے۔ اور بیوقوفی۔ "نہ" یا "ہاں" کہنے سے پہلے لازم ہے۔ کہ اس پر اچھی طرح غور کیا جائے۔

"ان کی ماتحتی قبول نہ کرنا" اس کا مطلب تو صاف ہی ہے۔ ان کا حکم نہ ماننا۔ ان کا مقصد حل نہ ہونے دینا۔ ہر ہٹلر برطانیہ پر قبضہ کرنے کا تو خیال ہی نہیں رکھتا۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ یہ ہے۔ کہ برطانیہ والے ہار مان لیں۔ ہارنے والے سے جیتنے والا جو چاہے مانگ سکتا ہے۔ اور اسے وہ دینا پڑتا ہے۔ لیکن وہ جو ہار نہ مانے اس کے ساتھ تو جب تک وہ زندہ رہے۔ دشمن کو لڑنا ہی پڑتا ہے اس لئے ستیہ گرہی نے خیال کیا۔ کہ دشمن کے مارنے سے پہلے ہی مر جانا چاہئے۔ یعنی جسم کا موہ چھوڑ کر روح پر فتح حاصل کر لینا جب مرنے کا ہی تہیہ کر لیا۔ تو کسی کو مار کر مرنے سے کیا مطلب؟ مارتے مارتے مرنے کا مطلب ہے۔ ہار کر مرنا۔ جیتے جی اگر قبضہ نہ ملے۔ تو مار کر قبضہ پانے کی امید تو دشمن کے دل میں رہتی ہے۔ لیکن جس نے مدمقابل کو مار کر غالب رہنے کا خیال ہی چھوڑ دیا ہو۔ اسے مارنے میں دشمن کو لطف نہیں آتا۔ شکار کھیلنے والے ہر ایک آدمی کو اس بات

کا عملی تجربہ ہے۔ کسی کو گاڑے بھینس کا شکار کھیلتے آج تک نہیں سنا۔

میرے یہ لکھنے سے آپ کے دل میں کئی خیالات پیدا ہوں گے آپ یہ بھی خیال کریں گے۔ کہ آپ کے سارے سوالات کا جواب آپ کو نہیں ملا۔ میری تو لکھتے وقت یہ خواہش ہی نہ تھی۔ کہ جتنے بھی سوال اس سلسلہ میں اٹھ سکتے ہیں۔ ان سب کو لیتا جاؤں۔ اس لئے جواب دینے کا ایک عاجزانہ سا طریقہ میں نے اختیار کیا ہے۔ جان بوجھ کر چند مثالیں میں نے دی ہیں۔ ان سے آپ اپنے من میں اٹھنے والے سوالات کا جواب دے سکیں گے۔

روحانی اعتماد اور خود اعتمادی کا مطلب ہر شخص الگ الگ کرے گا۔ ہر ایک کا دماغ اپنا اور علیحدہ ہوتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ انسانیت کا مطلب نکالنے میں اکثر بھولیں ہوتی ہیں۔ کئی بار میں نے یہ تجربہ کیا ہے۔ کہ ایسے لوگ بہت نازک مزاج بن کر ہر ایک بات میں ہی اپنی توہین سمجھتے ہیں۔ اصل میں انسانیت کا مطلب ہی نہیں سمجھتے۔ ہاں! جس چیز کو آپ انسانیت مان لیں۔ اس کے لئے مٹ جانے کا آپ کو حق حاصل ہے۔ لیکن کسی کو مارنے کا ہرگز نہیں۔

تعمیری پروگرام

سوال:- تعمیری پروگرام کے ذریعہ عوام میں کون کون سے اوصاف پیدا کرنا مقصود ہے۔ تعمیری کام کرنے والوں میں کیا کیا صفات ہونی چاہیں۔ جس سے اُن کا کام آسان اور قابل ستائش طور پر سرانجام ہو سکے؟

جواب:- تعمیری کام میں تو بہت کچھ آجاتا ہے۔ (۱) ہندو مسلم یا فرقہ وارانہ اتحاد (۲) انسداد چھوت چھات، (۳) بندش شراب (۴) کھدر (۵) دیہاتی دستکاری (۶) صفائی دیہات (۷) نئی یا بنیادی تعلیم (۸) تعلیم بالغان (۹) استری سیوا (۱۰) ملکی زبان کا ہی پرچار۔ (۱۱) ملکی زبان کا پریم۔ (۱۲) اروگ شکشا (صحت)۔ (۱۳) اقتصادی مساوات۔ اس فہرست میں اور بھی بہت سی چیزیں شامل کی جا سکتی ہیں۔ یہ فہرست اتنی وسیع ہے۔ کہ جو کچھ اس میں رہ گیا معلوم دیتا ہے۔ وہ بھی اس میں شامل ہے۔ یہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ آپ دیکھیں گے۔ کہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں۔ جن کو چھوڑ دینے کی وجہ سے ہم غلام بنے ہوئے ہیں۔ آپ یہ بھی دیکھیں گے کہ کانگرس کے تعمیری پروگرام میں یہ سب چیزیں نہیں گنی جاتیں۔ اس میں تو پہلی چار دیہاتی دستکاری نئی تعلیم کی سنستھا جو کانگرس نے قائم کی ہے۔ یہ دونوں شامل کر کے کل چھ چیزیں ہی گنی جاتی ہیں۔ اب ہمیں آگے

بڑھنا ہے۔ عدم تشدد کو پختہ کرنا ہے۔ مکمل کرنا ہے۔ چنانچہ تعمیری کام کو توسیع دی گئی ہے۔ اگر عدم تشدد کے ذریعہ ہم سوراجیہ حاصل کریں۔ تو اسی شکتی سے ہم اس کی حفاظت بھی کر سکیں گے۔ اس میں شک نہ ہونا چاہئے۔ اس مقصد کا حصول اس پر عمل کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ جس ترتیب میں یہ سب باتیں میں نے رکھی ہیں۔ یہ ان کی درجہ بدرجہ اہمیت کے لحاظ سے نہیں رکھی گئیں۔ بلکہ جیسے جیسے وہ میری قلم کے سامنے آتی گئیں۔ میں نے انہیں گن دیا ہے۔ عام طور پر تو میں آج کل کھدر کی ہی بات کرتا ہوں۔ کیوں کہ اس کام میں کروڑوں انسان روزمرہ اپنی امداد پہنچا سکتے ہیں۔ ان کا حساب بھی رکھا جا سکتا ہے۔ اور نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے۔ فرقہ وارانہ اتحاد اور انسداد چھوت چھات کے بارہ میں ایسا نہیں کیا جا سکتا یہ چیزیں اگر ایک بار ہمارے جیون میں اتر آویں۔ تو پھر کوئی بات کرنے کی باقی نہیں رہ جاتی۔

اب ذرا سارے کام پر نظر دوڑ لیئے۔ ہندو مسلم یا فرقہ وارانہ اتحاد کے بغیر ہم ہمیشہ اپاہج رہیں گے۔ اپاہج ہندوستان بھلا سوراجیہ کیسے حاصل کر سکتا ہے۔ ہندو مسلم سکھ عیسائی۔ پارسی اور یہودی وغیرہ ان سب اجزا کو ملا کر ہندوستان بنتا ہے۔ ان میں سے ایک بھی جزو جو کوئی بھول جاتا ہے۔ وہ تعمیری کام کو نہیں جانتا۔

چھوت چھات کا بھوت جب تلک ہندوؤں میں گھسا رہے گا وہ خود سنسار کے اچھوت بنے رہیں گے۔ اچھوتوں کو عدم تشدد کا سوراجیہ نہیں مل سکتا۔ جو اچھوت کہلاتے ہیں۔ انہیں اپنے بہن بھائی سمجھنے اور اس پر عمل کرنے والے کے سامنے اونچ نیچ کا سوال پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ذاتوں کی جھوٹی تقسیم نہیں ہو سکتی اس کے لئے تو دنیا بھی ایک خاندان ہے۔ عدم تشدد کے سوراجیہ میں کسی بھی رعایا کی مخالفت نہیں ہو سکتی۔

جو رعایا کسی نشیلی چیز شراب وغیرہ کے استعمال کی عادی بن چکی ہے۔ یا بن رہی ہے۔ وہ عدم تشدد کا سوراجیہ حاصل نہیں کر سکتی۔ دنیا کا تجربہ ہے۔ کہ نشے میں چور رہنے والا آدمی نیتی کا پالن ہی نہیں کر سکتا۔ یہ بات کبھی نہیں بھولنی چاہیئے۔

یہ تو سبھی مانتے ہیں۔ کہ کھدر کے بغیر کروڑوں کو فاقہ کشی سے نہیں بچایا جا سکتا۔ اس لئے اس سلسلہ میں زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ اتنا کہ دینا ہی کافی ہے۔ کہ وہ کاریگر جو دیہات میں پڑے پڑے ہی ختم ہو رہے ہیں۔ کھدر کے ذریعہ ان کا بھی نیا جنم ہو جائیگا بڑھئی اور لوہار کے بغیر کھدر کا کام ناممکن ہے۔ یہ چیزیں اگر دیہات میں ہی تیار کی جاویں۔ تبھی یہ اپنے قدموں پر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

کھدر کے علاوہ دیگر دیہاتی دستکاریوں کی ضرورت ہے

اس بات پر پورا زور نہیں دیا گیا۔ اسی لئے کھدر پہننے والے دوسرے ملوں کی یا بدیشی اشیاء کے استعمال میں کوئی خرابی نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں نے کھدر کا مقصد ہی نہیں سمجھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ گرام ادیوگ (دیہاتی دستکاری) اگرچہ شروع کرکے کانگریس نے تو اس کو بھی کھدر کے ساتھ جگہ دی ہے۔ لیکن لوگ اس بات کو بھول جاتے ہیں۔ سورج کے بغیر جیسے سیارے نکمے ہیں۔ سیاروں کے بغیر اسی طرح سورج بھی بے نور ہو سکتا ہے۔ جگت کا سارا چکر ایک دوسرے کے سہارے پر ہی چل سکتا ہے۔ گرام ادھار کے بغیر ہندوستان کا ادھار ناممکن ہے۔

گرام ادھار (دیہاتی ترقی) میں اگر دیہات کی صفائی شامل نہ ہو تو ہمارے دیہات کوڑے کے انبار کے مانند بن جائیں۔ دیہات کی صفائی کا سوال دیہاتیوں کی زندگی کا ایک جزو اعظم ہے۔ سالہا سال سے جس گندگی میں رہنے کی ہمیں عادت پڑ چکی ہے۔ اسے دور کرنے کے لئے کار عظیم کی ضرورت ہے۔ جو شخص صفائی دیہات کا طریقہ نہیں جانتا۔ خود بھنگی کا کام نہیں کر سکتا۔ وہ گرام سیوا کے لائق نہیں بن سکتا۔

نئی تعلیم کے بغیر ہندوستان کے سارے بچوں کو ہی تعلیم دنیا قریب قریب ناممکن ہے۔ یہ امر مسلمہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے گرام سیوک کو اس کا علم ہونا چاہئے۔ لازم ہے۔ کہ وہ نئی تعلیم کا استاد

ہو۔ بالغان کی تعلیم اس کے ساتھ خود بخود چلی آوے گی۔ نئی تعلیم کا رواج ہوتے ہی ہمارے بچے ہی بالغوں کے استاد بن جائیں گے۔ گرام سیوک کے دل میں بالغوں کو تعلیم دینے کی لگن ہونی چاہیئے۔

عورت کو مرد کے جسم کا آدھا تسلیم کیا گیا ہے۔ اس لئے جب تک عورت کے حقوق مرد کے قانوناً مساوی نہیں مانے جاتے۔ تب تک گھروں میں لڑکی کی پیدائش کا لڑکے کی پیدائش کے برابر استقبال نہیں کیا جا سکتا۔ یوں سمجھیئے کہ ہندوستان ادھرنگ کے مرض میں مبتلا ہے۔ عورت کی بے عزتی عدم تشدد کے اصول کے خلاف ہے۔ گرام سیوک کو چاہیئے۔ کہ وہ ہر ایک عورت کو اپنی ماں بہن یا بیٹی کے برابر سمجھے۔ اور ان کے ساتھ عزت سے پیش آوے اچھا گرام سیوک ہی دیہاتیوں کا اعتماد حاصل کر سکتا ہے۔

بیمار رعایا کا سوراجیہ حاصل کر لینا بھی میں ناممکن سمجھتا ہوں۔ اس لئے تندرستی کی جو بے عزتی ہم کرتے ہیں۔ وہ دور ہو جانی چاہیئے۔ اور کہ گرام سیوک کو تندرستی قائم رکھنے کا پورا علم ہونا چاہیئے۔

ملکی زبان کے بغیر ملک نہیں بن سکتا۔ ہندی۔ ہندوستانی اردو کے جھگڑے میں نہ پڑ کر۔ گرام سیوک کو اگر وہ ملکی زبان نہیں جانتا۔ تو اُسے سیکھ لینی چاہیئے۔ اس کی زبان ایسی ہونی چاہیئے

جسے ہندو و مسلمان سب سمجھ سکیں۔

انگریزی کے پریم میں پڑکر ہم نے ملکی زبان کی مخالفت کی ہے۔ اس مخالفت کے پرائشچت کے طور بھی۔ قومی سیوک قومی زبان کے لئے عوام میں پریم پیدا کرے گا۔ ہندوستان کی زبانوں کے ساتھ اسے انس اور عزت ہوگی۔ اس کی اپنی مادری زبان چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ جس جگہ وہ رہے گا۔ وہاں کی زبان خود سیکھ کر وہاں کے لوگوں کو اپنی زبان کی جانب راغب کرنے کی کوشش کرے گا۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اگر اقتصادی مساوات کا خیال نہ رکھا جاوے۔ تو یہ سب نکما سمجھنا چاہیئے۔ مساوات کا یہ مطلب نہیں کہ ہر ایک کے پاس برابر دولت ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ ہر ایک کے پاس کپڑا۔ لتا گھر بار اور کھانے پینے کا سامان اتنا ہوگا۔ جس سے وہ آرام سے گذر کر سکے۔ جو تباہ کن فرق آج کل دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ صرف عدم تشدد کے طریقوں سے ہی ختم ہوگا۔ لیکن اس کے لئے تو ایک علیحدہ مضمون کی ضرورت ہے۔ یہ پھر سہی۔ مجھے امید ہے اس جواب سے آپ کی کچھ تسلی ہو جائے گی۔

کاتنے کے علاوہ اور کیا؟

سوال:- چرخہ میں عموماً کافی عرصہ تک، اور بغیر کسی تکان محسوس کئے کات سکتا ہوں۔ جیساکہ کسی ستیاگرہی کو کرنا چاہیئے لیکن ان لوگوں پر جو اپنے نام ستیاگرہیوں میں لکھوا چکے ہیں ملک کو ستیاگرہ کے لئے تیار کرنے کی ایک بھاری ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ میں اس بات کے ساتھ اتفاق رکھتا ہوں۔ کہ ستیاگرہ کی با اثر تیاری کا سب سے موثر ذریعہ یہ ہے۔ کہ ستیاگرہی اپنے اپنے گھروں میں ہی چرخے چلا کر عوام کے سامنے ایک مثال قائم کر دیں۔ لیکن کیا کسی ایسے پروگرام کی ضرورت نہیں ہے۔ جس سے خرچ بھی کم ہو۔ اور عوام متاثر بھی زیادہ ہوں۔

مثال کے طور پر میں یہ تجویز کروں گا۔ کہ ہر ایک ڈسٹرکٹ کانگرس کمیٹی اپنے علاقہ کے سرگرم اور معمولی ستیاگرہیوں کا ایک رجسٹر رکھے ہر ستیاگرہی دوسرے ستیاگرہیوں کے ساتھ تعلق رکھے۔ اور ایک ہفتہ میں کم از کم ایک دن تو ایسا ضرور مقرر کر دیا جائے۔ جب یہ تمام ستیاگرہی دس دس یا زیادہ تعداد کے گروہوں میں اکٹھے ہو کر وہاں کے لوگوں کو کتائی کے متعلق سب کچھ سمجھا دیں۔ کتائی سے متعلقہ لٹریچر ان کو پڑھائیں۔ اپنے کاتے ہوئے سوت کے نمونے انہیں دکھائیں۔ اور خود کات کر کپڑے

بنوانے والے کو جو فائدہ رہتا ہے۔ انہیں سمجھا ہیں۔ وہ لوگ جو کھدر بھنڈاروں سے خریدنے کے قابل ہیں۔ انہیں اپنا کاتا ہوا سوت دان کر دینے کے لئے کہا جائے۔ اپنے حلقہ اقتدار میں میں نے چند دوستوں کی مدد سے یہ تجربہ کیا ہے۔ کاتیوں کے لئے میں نے تین چرخے بھی خرید لئے ہیں۔ ان میں سے ایک نے تو بارہ آٹیاں کات بھی لی ہیں۔ اس کے علاوہ ہم یہ بھی کوشش کر رہے ہیں۔ کہ دیہاتی دستکاریوں کو مقبول عام بنایا جائے۔

ستیاگرہیوں کے کئے جانے والے کام کا فی الحال تو کوئی ریکارڈ نہیں رکھا جا رہا۔ دوسروں کا امتحان نہیں لینا بھی نہ چاہئے۔ لیکن ڈسٹرکٹ کانگرنس کمیٹی کا کیا یہ فرض نہیں۔ کہ یہ دیکھیں کہ ستیاگرہی پوری طرح کھدر پہنتے ہیں یا نہیں جہاں تک ممکن ہو وہ دیہات کی تیار کردہ اشیاء کا ہی استعمال کرتے ہیں۔ مسلمان اور ہریجنوں کے ساتھ آزادانہ طور پر ملتے ہیں۔ اور کیا وہ ہندوستانی۔ اردو اور ہندی کو بول اور سمجھ سکتے ہیں یا نہیں؟ فی الحال تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سلسلہ میں کوئی خاص قاعدہ یا قانون نہیں بنایا گیا۔ ایکدفعہ ایک اصول بنایا گیا تھا۔ کہ ہر ستیاگرہی ہر سنیچر کو اپنے کام کی رپورٹ دیا کرے۔ لیکن ایک یا دو کے علاوہ باقی کسی نے بھی ابھی تک اس کی پرواہ نہیں کی۔ عدم تشدد کا یہ مطلب نہیں۔ کہ کوئی ضابطہ ہی نہ ہو۔ دیکھنے میں آیا ہے۔ کہ متحدہ یا جھنڈوں کی کتائی کے موقعہ پر

کم از کم آدھے ممبر تو ضرور ہی غیر حاضر ہوتے ہیں۔ اور اگر کبھی کسی کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ تو اس کی اس بنا پر مخالفت کی جاتی ہے۔ کہ ایسا کرنا غلطی ہوگی۔ اور کہ اس کی اس خامی کو نرم نرم دلائل اور ترغیب وغیرہ سے دور کیا جانا چاہئے۔ ان حالات میں جب کہ لوگ اپنے ہی بنائے ہوئے اصولوں کی خود ہی کھلے بندوں اور جان بوجھ کر خلاف ورزی کر رہے ہوں ایسا کرنا کیا واہیات نہ ہوگا۔ ایسے لوگ سول نافرمانی کر ہی کس طرح سکتے ہیں؟

جواب:۔ مندرجہ بالا چٹھی میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ تو بھی میں اسے شائع کرتا ہوں۔ کیونکہ لکھنے والے بھائی اپنی تجاویز پر خود عمل کرتے ہیں۔ جو لوگ بلا وجہ قاعدہ توڑتے ہیں۔ انہیں سمجھانے کا سوال نہیں اٹھتا۔ ان کا نام فہرست میں سے نکل جانا چاہئے پرائشچت کرکے دوبارہ چاہے وہ داخل ہو جاویں۔ سپاہی کا قاعدہ توڑنا اتنا ہی خطرناک ہے۔ جتنا کہ کسی مشین کے پرزے کا بگڑ جانا۔ موٹر کا ایک پرزہ اگر ٹوٹ جائے۔ تو اس میں بیٹھنے میں خطرہ تو ہوتا ہی ہے۔ اور اگر کوئی خاص پرزہ بیکار ہو جائے۔ تو موٹر چلائی ہی نہیں جا سکتی۔ جو بات مشین پر عائد ہوتی ہے۔ وہ سنیہ آگرہی فوج پر سختی سے عائد ہونا چاہئے۔ لیکن قاعدہ کو عمل میں لانے کے طریقہ میں ضرور فرق ہوگا۔ ہتھیار بند سپاہی کو ضابطہ شکنی

کی پاداش میں جیل میں جانا۔ کوڑے کھانا۔ یا اپنا سر تک بھی کھونا پڑتا ہے۔ جو ستیہ آگرہی قاعدہ توڑے گا۔ اس کا تو نام فہرست میں ہی سے نکل جائے گا۔ مگر سزا تو جو اس کا دل اس کو دیگا وہی ہو گی۔

کاتنے کے علاوہ جن کاموں کے کرنے کی تجویز تحریر کنندہ نے لکھی ہے۔ وہ سب ٹھیک ہے۔ کانگرس کی پالیسی کی وجہ سے کیا تبدیلی ہو گی۔ یہ دیکھنا پڑے گا۔ میری صلاح پر عمل کرنے والے کتنے نکلیں گے۔ یہ نتیجہ چل جانے کے بعد ہی تنظیم پر غور کیا جائیگا یہ تو مجھے صاف معلوم دیتا ہے۔ کہ ستیا گرہیوں کی بے شمار ٹولیاں بننی چاہیں۔ اس کے متعلق میں لکھ چکا ہوں۔ اس کے مطابق عمل کر کے آپ جہاں تک پیدل چل سکیں۔ اتنے حلقہ میں جتنے ستیا گرہی ہوں۔ ان کی آپ تنظیم کریں۔ یہ ٹولی دوسری ٹولیوں سے آزاد رہے گی۔ اس ٹولی پر بھی قواعد تو وہی عائد ہوں گے۔ لیکن اس کا انتظام دوسروں سے آزاد ہو گا۔ اس طرح کرنے سے اگر ایک ٹولی ٹوٹ بھی جائے۔ تو اس سے دوسری ٹولی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ پہلے زمانہ میں راج کی بناوٹ ایسے ہی ہوتی تھی۔ جتنے دیہات تھے۔ سب خود مختارانہ طور پر منظم تھے۔ انتظام چلانے والوں کو دیہات کے لوگ خود مقرر کرتے تھے۔ یہی ان کی پنچایت تھی۔ پنچایت قانون بناتی تھی۔ اور ان پر عمل بھی کراتی تھی۔ لوگ خوشی سے اس کا حکم مانتے

تھے ۔ یہ عدم تشدد پر مبنی انتظام تھا۔ جیسا بھی تھا۔ وہ آج تک چلتا آیا ہے ۔ انگریزی حکومت نے اس کو بالکل برباد تو نہیں کیا۔ لیکن اُسے ہلا دیا ہے ۔ اس پُرانے طریقہ کو میں مکمل طور پر غیر متشددانہ نہیں کہوں گا۔ لیکن اس میں عدم تشدد کا بیج تھا۔ ایسا ہو یا نہ ہو۔ میری ستیاگرہی ٹولی کی سکیم مندرجہ بالا طریقہ کے مطابق ہے ۔۔ ایسی ٹولیاں خود مختار ہوتے ہوئے بھی وقت آنے پر اکٹھی کام کرنے والی ہی ثابت ہونی چاہییں ۔ کیونکہ انہیں ایک زنجیر میں باندھنے والی چیز عدم تشدد ہوگی ۔ اس لئے جس طرح ایک جیسی اینٹیں ایک دوسرے کے ساتھ رکھ کر خوبصورت سے خوبصورت مکان بنایا جا سکتا ہے ۔ اس طرح کئی ستیاگرہی ٹولیوں میں سے ایک عظیم گروہ پیدا ہو سکتا ہے ۔

کیا کیا جائے ؟

سوال:۔ ملک کی حالت دن بدن خراب ہوتی چلی جا رہی ہے سب جگہ گھبراہٹ بڑھ رہی ہے ۔ کہیں کہیں تو بدمعاشوں نے ہتھیار بند جتھے بنانے بھی شروع کر دئے ہیں ۔ تا کہ اگر سرکار کی طاقت ٹوٹ جائے یا کمزور پڑ جائے ۔ تو اس سے پیدا ہونے والی بدانتظامی کا وہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں ۔ خواہ یہ خطرہ آج نزدیک نہ ہو ۔ لیکن اس کی توقع پر غور نہ کرنا بیوقوفی ہوگی ۔ آپ یہ تو مانیں گے ۔ کہ آج تک

پچھلے بیس برس میں جتنی بھی عدم تشدد کی تعلیم ملک کو ملی ہے اس سے ایسی عدم تشدد کی طاقت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ کہ گڑبڑ اور گنڈاپن کا کامیابی سے مقابلہ کیا جا سکے۔ جو لوگ حالات سے آگاہ ہونے کے لئے آپ کی طرف نگاہیں لگائے بیٹھے ہیں۔ ان کا کیا فرض ہو جاتا ہے؟ کیا وہ سرکار کے خیالات میں حصہ لیں؟ اگر نہیں تو وہ کیا کریں؟ یقیناً وہ لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تو نہیں بیٹھ سکتے؟

جواب میں نہیں کہہ سکتا کہ ورکنگ کمیٹی کے حال کے بیان کے بعد کانگرس سچ مچ کیا کرے گی۔ اگر آپ کا اعتقاد ہے۔ کہ گڑبڑ اور ایسی چیزوں کا علاج عدم تشدد کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ تو یہ قدرتی ہے۔ کہ آپ اپنے آپ کو اپنے پڑوسیوں کو اور ایسے لوگوں کو جن پر آپ اثر ڈال سکتے ہیں۔ عدم تشدد کے ذریعہ حفاظت کرنے کے طریقوں پر تیار کریں گے۔

آپ کا یہ کہنا ٹھیک ہے۔ کہ کوئی بھی ذمہ دار آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ سکتا۔ عدم تشدد کی تیاری کے لئے بہت عرصہ پہلے سے تعلیم لینے کی ضرورت ہے۔ عدم تشدد کی تیاری میں دل کو تیار کرنے کا سوال ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ گڑبڑ کی توقع ہو سکتی ہے۔ مگر آپ اگر عدم تشدد پر کاربند ہیں۔ تو خوف کی کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بدانتظامی آنے والی ہے۔ یہ

مان کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیئے۔ جیسے یقیناً یہ مانتے ہوئے بھی کہ ایک روز مرنا ہے۔ ہم بیٹھے بیٹھے سوچتے نہیں رہتے۔ کہ موت ایک دن آرہی ہے۔ اگر بدقسمتی سے گڑبڑ پیدا ہو ہی جائے گی۔ تو آپ آپ کے ساتھی اور آپ کے پیروکار اسے روکنے کے لئے زندگی کی قربانی دے دیں گے۔ جو لوگ ڈاکو اور بدمعاش مانے جانے والے لوگوں کو مارنے کی کوشش میں اپنی جان دے دیتے ہیں۔ وہ کچھ زیادہ اچھا کام کرتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ شاید وہ کچھ گھٹیا درجہ کا کام ہی کرتے ہیں۔ وہ اپنی جان خطرہ میں ڈالتے ہیں اور ان کی موت کے بعد اندھیرا ہی اندھیرا رہ جاتا ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے۔ کہ تشدد کا جواب تشدد سے دے کر وہ تشدد کی آگ بھڑکاتے ہیں۔ جو لوگ بغیر مقابلہ کئے! وہ اپنا پورا بلیدان دے کر تشدد کے خوف کو مٹا بھی سکتے ہیں۔ مگر یہ سچا عدم تشدد کا کام تب ہی ہو سکتا ہے۔ جب آپ کے دل میں یہ اعتقاد ہو۔ کہ چور ڈاکو جس سے آپ ڈرتے ہیں۔ در اصل وہ اور آپ ایک ہی ہیں۔ اس لئے اچھا تو یہی ہے۔ کہ اس کے ہاتھوں آپ مریں۔ بجائے اس کے کہ وہ آپ کا نادان بھائی آپ کے ہاتھوں مرے۔

باب چہارم

مہاتما گاندھی کے اخلاقی اور مذہبی خیالات

یار وده جیل کو گاندھی جی نے "یار وده مندر" کے نام سے پکارا ہے۔ ان کا وہاں کا پروگرام یہ تھا۔ کہ وہاں انہیں کچھ تو اخبار باہر کے پڑھنے کو ملتے تھے۔ اور آشرم سے چیٹھیوں کا جو پلندہ آتا تھا۔ ان کا جواب دینا ہوتا تھا۔ با ایں ہمہ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ انہوں نے اپنی اس تنہائی کے وقت کو عام طور پر "سوتر یگیہ" یعنی چرخہ بھگتی اور گیتا کے احکام پر عمل پیرا ہونے میں ہی خرچ کیا۔ ان دنوں آپ سے کچھ دوستوں نے مانگ کی کہ سابرمتی آشرم میں رہنے والوں کے لئے علوم معرفت کی ضرورت کو پورا کیا جائے چنانچہ

اس مانگ کو پورا کرنے کے لئے مہاتما جی نے وہاں سے ایک سلسلہ مضامین قلمبند کیا۔ جس سے مہاتما جی کے مذہبی و اخلاقی خیالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ ہم ان میں سے چیدہ چیدہ مضامین ناظرین کی واقفیت کے لئے حوالہ قلم کرتے ہیں۔

ستیہ (حق)

یارودہ جیل مورخہ ۲۷

ہم لوگوں کی سنستھا (انسٹی ٹیوشن) کی جڑ ہی ستیہ کے آگرہ (بھروسہ) میں ہے۔ اس لئے میں سب سے پہلے ستیہ کو ہی لیتا ہوں۔

([redacted]) "ستیہ" لفظ "ست" (सत) سے بنا ہے۔ "ست" یعنی "ہونا"۔ اور "ستیہ" ہے ہونا پن (ہستی۔ وجود) اور "ستیہ" کے سوا دوسری کسی چیز کی ہستی ہی نہیں ہے۔ اس لئے پرمیشور کا سچا نام ہی "ست" یعنی "ستیہ" ہے۔ لہذا پرمیشور "ستیہ" ہے ایسا کہنے کی بجائے "ستیہ" ہی پرمیشور ہے۔ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے۔ ہم لوگوں کا کام راجہ بغیر۔ سردار بغیر نہیں چلتا۔ اس واسطے پرمیشور (سب کا مالک) نام زیادہ مشہور ہے۔ اور رہے گا۔ لیکن غور کرنے سے تو "ست" یا "ستیہ" ہی سچا نام ہے۔ اور یہی پورے معنے بھی ادا کرتا ہے۔

اور جہاں ستیہ ہے۔ وہاں گیان (علم) شدھ گیان (خالص علم) ہے ہی۔ جہاں ستیہ نہیں ہے۔ وہاں شدھ گیان ممکن نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے ایشور نام کے ساتھ (چت) یعنی گیان کے لفظ کو جوڑا گیا ہے۔ اور جہاں ستیہ گیان ہے۔ وہاں آنند ہی ہوگا۔ شوک (رنج) ہوگا ہی نہیں۔ اور ستیہ شاشوت (یکساں دوامی) ہے۔ اس لئے آنند (راحت) بھی شاشوت (یکساں۔ دوامی) ہوتا ہے۔ اسی سبب سے ہم ایشور کو سچدانند کے نام سے بھی انتے ہیں۔

اس ستیہ کی پرستش کے لئے ہی ہماری ہستی (وجود) ہے۔ اسی کے لئے ہماری ہر ایک پرورتی (ارادہ) ہے۔ اسی کے واسطے ہمارا ہر ایک سانس ہونا چاہیئے۔ ایسا کرنا سیکھ لیں تو ہمیں دیگر سب نیم (دستور) خود بخود دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اور ان کی پابندی بھی آسان ہو جاتی ہے۔ ستیہ کے بغیر کسی بھی نیم کی پابندی ٹھیک طور پر ہونی ناممکن ہے۔

عام طور پر ہم "ستیہ" کے معنی "سچ بولنا" بس اتنا ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن ہم نے "ستیہ" کے لفظ کا ویاپک (وسیع) معنوں میں استعمال کیا ہے۔ خیال میں۔ زبان اور عمل میں ستیہ ہی ستیہ ہو اس ستیہ کو مکمل طور پر ماننے والے کے لئے دنیا میں اور کچھ جاننے کے قابل نہیں رہتا۔ کیونکہ سمپورن گیان (علم کل) اس کے اندر

موجود ہے ۔ یہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں ۔ اس میں جو موجود نہ ہو وہ ستیہ نہیں ہے ۔ گیان نہیں ہے ۔ پھر اس میں سے سچا آنند (راحت) تو مل ہی کیسے سکتا ہے ؟ اگر ہم اس کسوٹی کو کام میں لانا سیکھ لیں ۔ تو ہمیں فوراً یہ معلوم ہو جایا کرے ۔ کہ کون سا ارادہ یا خواہش قابل قبول ہے ۔ اور کون سا قابل ترک ۔ کیا دیکھنے کے قابل ہے اور کیا نہیں ۔ کیا پڑھنے کے قابل ہے ۔ اور کیا نہیں ۔

مگر یہ پارس منی روپ (مس زر) کام دھینو (سب خواہشات پورا کرنے والی گائے) روپ "ستیہ" حاصل کیسے ہو ؟ اس کا جواب بھگوان نے دیا ہے ۔ "ابھیاس اور ویراگ سے" ۔ ستیہ کا میل ملاپ "ابھیاس" اور ماسوائے اس کے باقی سب اشیاء سے لاپرواہی "ویراگ" کہلاتا ہے ۔ یہ ہوتے ہوئے بھی ہم دیکھیں گے کہ جو ایک کے لئے ستیہ ہے وہ دوسرے کے لیے استیہ ہے ۔ اس سے گھبرانا نہیں چاہیئے ۔ جہاں شدھ برتین (خالص کوشش) ہے ، وہاں مختلف معلوم ہونے والے سب ستیہ ایک ہی درخت کے بے شمار الگ الگ نظر آنے والے پتوں کی مانند ہیں ۔ کیا پرمیشور (خدا) بھی ہر ایک آدمی کو الگ دکھائی نہیں دیتا ؟ پھر بھی ہم جانتے ہیں ۔ کہ وہ ایک ہی ہے ۔ مگر ستیہ نام ہی پرمیشور کا ہے ۔ اس لئے جسے جو ۔ ہمیشہ جان پڑے ۔ اسی کے مطابق ہی وہ عمل کرے ۔ تو

اس میں کوئی نقص نہیں۔ اتنا ہی نہیں۔ بلکہ یہی فرض ہے۔ اگر ایسا کرنے میں بھول ہو گی بھی۔ تو وہ ضرور سدھر جائے گی۔ کیونکہ ستیہ کی کھوج (تجسس) کے ساتھ تپشچریہ (ریاضت) ہوتی ہے۔ یعنی خود دکھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس کے پیچھے مرنا ہوتا ہے اس لئے اس میں خود غرضی کی تو بو تک نہیں ہوتی۔ ایسی بے غرضانہ کھوج کرتے ہوئے کوئی آخر تک غلط راستے پر آج تک نہیں رہا۔ ذرا سا ادھر ادھر ہوتے ہی ٹھوکر لگتی ہے۔ اور پھر وہ سیدھے راستے چلنے لگتا ہے۔ اس واسطے ستیہ کی آرادھنا (تلاش)، بھگتی (عشق) ہے۔ اور بھگتی تو سر کا سودا ہے۔ اور وہی ہری کا مارگ (خدا کا راستہ) ہے۔ جس میں بزدلی کے لئے گنجائش نہیں۔ جس میں ہار (شکست) جیسی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ وہ تو مر کر جینے کا منتر (جادو) ہے۔

مگر اب ہم اہنسا (عدم تشدد) کے بالکل پاس آپہنچے ہیں اس پر اگلے ہفتے وچار کروں گا۔

اس ضمن میں ہریش چندر۔ پرہلاد۔ رام چندر۔ امام حسنؑ و حسینؑ ... ... عیسائی سنتوں آدمی کے کارنامے قابل غور ہیں۔ اور اگلے ہفتہ تک سب بچے بڑے۔ عورت۔ مرد۔ چلتے بیٹھتے کھاتے۔ پیتے۔ کھیلتے۔ یعنی سارے کام کرتے ہوئے ستیہ کی رٹ لگاتے رہیں۔ اور ایسا کرتے کرتے خالص نیند حاصل کر لیا کریں

تو کیا ہی اچھا ہو، یہ ستیہ روپی پرمیشور میرے لئے تو رتن چنتامنی (انمول ہیرا) ثابت ہوا ہے۔ سب کے لئے ایسا ہی ثابت ہو۔

اہنسا (عدم تشدد)

باروده جیل مورخہ ۲۹/۷/۳۰

ستیہ کی اہنسا کی راہ جتنی سیدھی ہے۔ اتنی تنگ بھی ہے کھانڈے (تلوار) کی دھار پر چلنے کے سمان ہے۔ نٹ بڑی ہوشیاری سے جس ڈور پر چل سکتا ہے۔ ستیہ اور اہنسا کی ڈور اس سے بھی باریک ہے۔ ذرا چوکے نہیں۔ کہ آئے نیچے دھڑام سے! پل پل کی خبرداری سے ہی اس میں کامیابی ہو سکتی ہے۔

لیکن ستیہ کا مکمل حصول تو اس جسم میں ناممکن ہے! اس کا محض تصور ہی کیا جا سکتا ہے۔ فانی جسم کے ذریعہ غیر فانی دھرم کا مشاہدہ ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے آخر میں شردھا (اعتقاد) کی ضرورت بنی رہتی ہے۔

اسی وجہ سے جگیاسو (متلاشی) کو اہنسا دستیاب ہوئی۔ متلاشی کے سامنے یہ سوال پیدا ہوا۔ کہ راستے میں آنے والی مشکلات کو برداشت کرے۔ یا جو راستہ میں حائل ہو اس کو تباہ کرتا ہوا آگے بڑھے۔ اس نے دیکھا کہ اگر تباہ کرتا ہے۔ تو آگے نہیں بڑھتا۔

دروازہ پر ہی رہ جاتا ہے۔ مشکلات برداشت کرتا ہے۔ تو آگے
بڑھتا ہے۔ پہلی ہی تباہی میں اسے احساس ہو جاتا ہے۔ کہ جس
ستیہ کی اسے تلاش ہے۔ وہ باہر نہیں اندر ہے۔ اس لئے
جیسے جیسے تباہی کرتا جاتا ہے۔ ویسے ویسے پیچھے پڑتا جاتا ہے۔
ستیہ دور ہٹتا جاتا ہے۔
ہمیں چور ستاتے ہیں۔ اپنی حفاظت کے لئے ہم نے انہیں
سزا دی۔ اس وقت وہاں سے وہ ضرور بھاگ گئے۔ لیکن دوسری
جگہ جاکر سیندھ ماری۔ لیکن وہ جگہ بھی ہماری ہی ہے۔ یعنی ہم
اندھیری گلی میں جاکر ٹکرائے۔ چور کا خطرہ بڑھتا گیا۔ کیونکہ اس نے
تو چوری کو اپنا فرض سمجھ رکھا ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں۔ کہ اس سے
بہتر تو یہ ہے۔ کہ چور کے خطرہ کو برداشت کر لیا جائے۔ اس سے
اُسے (چور کو) سمجھ آجائے گی۔ تاہم برداشت کرنے پر ہم دیکھیں
گے۔ کہ چور کوئی غیر نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے تو سب اپنے ہیں۔
سب دوست ہیں۔ انہیں سزا نہیں دی جا سکتی۔ لیکن خطرہ
برداشت کر لینے پر ہی بس نہ ہونی چاہئے۔ اس سے بزدلی پیدا
ہو جائے گی۔ اس لئے ہمیں اپنا دوسرا خاص دہرم (فرض) نظر آیا۔
چور جب اپنے بھائی بندھ ہیں۔ تو اس کے متعلق اسی قسم کے ارادے
پیدا ہونے چاہئیں۔ یعنی ہمیں ان کو اپنانے کے ذرائع تلاش کرنے
کی تکلیف کو گوارا کرنے کو بھی تیار ہو جانا چاہئے۔ یہ اہنسا کا راستہ

ہے۔ اس میں درجہ بدرجہ تکلیفوں کو برداشت کرنے کا کام ہے اٹوٹ دھیرج (بُردباری) سیکھنے کا کام ہے۔ اور یہ ہو جائے۔ تو آخرکار چور ساہوکار بن جاتا ہے۔

ہمیں ستیہ کا زیادہ درشن نصیب ہوتا ہے۔ اس طریقہ سے ہم دنیا کو دوست بنانا سیکھتے ہیں۔ ایشور کی یا ستیہ کی مہماں (عظمت) کو زیادہ سمجھنے لگتے ہیں۔ مشکلات برداشت کرتے ہوئے بھی شانتی سکھ (امن و راحت) زیادہ ہو جاتا ہے۔ ہم میں ساہس بڑھتا ہے ہم شاشوت واشاشوت (فانی اور غیر فانی) کا بھید زیادہ سمجھنے لگتے ہیں۔ غرور مٹ جاتا ہے۔ نمرتا (عاجزی) بڑھتی ہے۔ پری گرہ (طمع۔ یا دوسرے کا حق دبانا) اپنے آپ گھٹ جاتا ہے۔ اور جسم میں بھری ہوئی میل دن بدن کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

یہ اہنسا وہ ٹھوس چیز نہیں جسے ہم آج دیکھتے ہیں۔ کسی کو نہ مارنا۔ تو ہے ہی۔ برے خیال کا پیدا ہونا تک بھی ہنسا (تشدد) ہے اُتاولہ پن (جلد بازی) ہنسا ہے۔ جھوٹ بولنا ہنسا ہے۔ دویش (دشمنی) ہنسا ہے۔ کسی کا برا چاہنا ہنسا ہے۔ جگت (دنیا) کے استعمال کے لئے جس چیز کی ضرورت ہے۔ اس پر قبضہ رکھنا بھی ہنسا ہے۔ لیکن ہم جو کھاتے ہیں۔ وہ دنیا کے لئے ضروری ہے۔ جہاں کھڑے ہیں۔ وہاں سینکڑوں سوکشم جیو (چھوٹے جاندار) پڑے ہوئے پیروں تلے کچلے جاتے ہیں۔ یہ جگہ اس کی ہے۔ تو پھر کیا ہم

آتم ہتیا (خودکشی) کر لیں؛ تو بھی چھٹکارا نہیں۔ وچار میں جسم کا سنسرگ (تعلق۔ واسطہ) چھوڑ دیں۔ تو آخر کار جسم بھی ہمیں چھوڑ دے گا۔ یہ موہ رہت (غیر مغرورانہ) سروپ (شکل یا صورت) ستیہ نارائن (الٰہی) ہے۔ یہ درشن (مشاہدہ) کم حوصلگی سے نہیں ہوتے یہ جسم ہمارا نہیں ہے۔ ہمیں ملی ہوئی دھروہر (مستعار سواری) ہے۔ ایسا سمجھ کر اس کا استعمال کرتے ہوئے ہمیں آگے بڑھنا چاہیئے۔

مجھے لکھنا تو چاہیئے تھا آسان۔ مگر لکھا گیا ہے مشکل۔ تاہم جس نے اہنسا کا تھوڑا بھی وچار کیا ہوگا۔ اسے سمجھنے میں مشکل نہ ہونی چاہیئے۔

اتنا سب کو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ اہنسا بغیر تلاش حق نا ممکن ہے اہنسا اور ستیہ (حق) سکے کے دونو اطراف یا چکنے دھبہ کے ہر دو پہلوؤں کی مانند بالکل یکساں ہیں۔ اس میں اُلٹے سیدھے کی پہچان کیسے ہو؟ تاہم اہنسا کو سادھن (ذریعہ) اور ستیہ کو سادھیہ (منزل مقصود) ماننا چاہیئے۔ سادھن ہمارے ہاتھ کی بات ہے۔ اسی وجہ سے اہنسا پرم دھرم مانی گئی۔ ستیہ پرمیشور ہوا۔ سادھن کی فکر کرتے رہیں گے۔ تو ایک دن سادھیہ کے درشن بھی ہو ہی جائیں گے۔ ان کا نشچیہ (یقین) کر لیا تو جگ جیت لیا۔ ہمارے راستہ میں خواہ کتنی مشکلات آویں۔ بیرونی

نظر سے خواہ ہماری کتنی شکست ہوتی نظر آوے۔ پھر بھی ہمیں وشواس (اعتقاد) نہ چھوڑ کر ایک ہی منتر جپنا چاہیے۔ ستیہ ہے وہی ہے۔ وہی ایک پرمیشور (خدا) ہے۔ اس کے ساکھشاتکار (حصول) کا ایک ہی راستہ۔ ایک ہی سادھن (ذریعہ) اہنسا (عدم تشدد) ہے۔ اسے کبھی نہ چھوڑوں گا۔ جس ستیہ روپ پرمیشور کے نام سے یہ پرتگیا (ارادہ) کی ہے وہ اس کے پالن (نبھانے) کرنے کا بل (طاقت) دے۔

اسپرشیتانوارن (अस्पृश्यता निवारण)

انسداد چھوا چھوت

یاروده جیل ۹ $\frac{۹}{۳۰}$

یہ برت بھی (अस्वाद) اسواد برت کی طرح نیا ہے۔ اور کچھ عجیب بھی معلوم ہوتا ہے۔ ۴ اتنا زیادہ ضروری ہے۔ اسپرشیتا (अस्पृश्यता) کے معنے ہیں۔ چھوا چھوت۔ یہ موقع بموقع دھرم کے نام یا بہانے سے روکاوٹ پیدا کرتی رہتی ہے۔ اور دھرم کو بدنام کرتی ہے۔ اگر آتما (روح) ایک ہی ہے ایشور (اللہ) ایک ہی ہے۔ تو اچھوت کوئی نہیں ہے۔ جس طرح بھنگی۔ چمار۔ اچھوت مانے جاتے ہیں۔ مگر دراصل اچھوت نہیں ہیں

۴ یعنی چھونا عجیب ہے

اسی طرح مردہ جسم بھی اچھوت نہیں ہے۔ وہ عزت اور رحم کا مستحق ہے۔ مردہ کو چھونے۔ تیل ملنے یا حجامت بنانے۔ بنوانے کے بعد اگر ہم نہاتے ہیں تو وہ صرف حفظانِ صحت کے نکتہ خیال سے ہوتا ہے۔ مردہ کو چھوکر یا تیل لگا کر جو نہ نہائے وہ گندا بھلے ہی کہا جائے۔ مگر وہ پاتکی نہیں ہے۔ پاپی نہیں ہے۔ یوں تو بچے کا میلا اٹھا کر ماتا جب تک نہ نہائے یا ہاتھ پیر نہ دھوئے۔ تب تک بھلے ہی اچھوت ہو۔ مگر بچہ جب کھیلتے کھیلتے اُسے چھوئے تو وہ چھوا نہیں جاتا۔ نہ اس کا آتما گندا ہوتا ہے۔ مگر جسے نفرت سے بھنگی یا چمار کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ وہ تو جنم (پیدائش) سے ہی اچھوت خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے خواہ کئی من صابون برسوں اپنے بدن پر رگڑا ہو خواہ وہ وشنو کا سا پہناوا رکھتا ہو۔ خواہ وہ مالا۔ کنٹھی۔ گلے میں بھی پہنتا ہو۔ خواہ وہ روزانہ گیتا کا پاٹھ کرتا ہو۔ اور خواہ وہ مصنف یا اخبار نویسی کا پیشہ ہی کیوں نہ رکھتا ہو۔ پھر بھی وہ اچھوت ہی خیال کیا جاتا ہے۔ ایسا جو دھرم مانا یا برتا جاتا ہے۔ وہ دھرم نہیں۔ ادھرم (لامذہبی) ہے۔ اور قابل ترک ہے۔ ہم برتوں میں انسداد چھوا چھوت کو جگہ دے کر یہ ثابت کرتے ہیں۔ کہ چھوا چھوت ہندو دھرم کا حصہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں گھسی ہوئی سڑاند (غلاظت) ہے۔ وہم ہے پاپ ہے۔ اور اس کا انسداد کرنا ہر ایک ہندو کا دھرم ہے۔ فرض اولین ہے۔ اسی

لئے جو اسے پاپ مانتے ہیں ۔ انہیں چاہیئے ۔ کہ اس کا پرائشچت (دفیعہ) کریں ۔ اور کچھ نہیں تو پرائشچت کے خیال سے ہی سمجھدار ہندو لوگ اچھوت کہلانے والے اپنے بہن بھائیوں کو اپنا دیں پریم سے سیوا بھاو سے اسے چھوئیں ۔ ان کو چھو کر اپنے آپ کو پوتر (پاکیزہ) ہوا سمجھیں ۔ اچھوت کے دُکھ دور کریں ۔ برسوں سے وہ کچلا گیا ہے ۔ اس لئے انہیں جو جہالت وغیرہ نقائص پیدا ہو گئے ہیں ۔ انہیں دور کرنے کے لئے مُستقل مزاجی سے اسے مدد دیں ۔ اور دوسرے ہندوؤں کو بھی ایسا کرنے کے لئے راضی کریں ۔ تیار کریں ۔ چھوا چھوت کو دور کرنے میں ۔ جو فوری یا سیاسی نتائج پیدا ہوتے ہیں ۔ انہیں برت دھاری (عہد لینے والا) تچھ (ناچیز) سمجھے گا ۔ وہ یا ویسے نتائج پیدا ہوں یا نہ ہوں ۔ تو بھی چھوا چھات کے انسداد کو برت (عہد) کی شکل میں اختیار کرنے والا ۔ اچھوت گنے جانے والوں کو اپنا دھرم سمجھ کر اپنا دے گا ۔ ستیہ وغیرہ پر عمل کرتے وقت ہمیں فوری نتائج کا خیال دل میں نہ لانا چاہیئے ۔ ستیہ (حق) پر چلنا ۔ برت دھاری (عہد لینے والے) کے لئے ایک دلیل نہیں ۔ بلکہ یہ تو اس کا جزو بدن ہے ۔ اس کا سبھاؤ (عادت) ہے ۔

انسداد چھوا چھوت بھی عہد لینے والے کے لئے ویسا ہی ہے ۔ اس چھوا چھوت کی اہمیت سمجھ لینے پر ہمیں معلوم ہوگا ۔ کہ یہ دسٹراندا محض بھنگی یا چمار پکارے جانے والوں کے متعلق ہی گھُس گئی ہو ۔ یہ

بات نہیں ہے۔ بلکہ سڑاند کی عادت ہے۔ کہ وہ پہلے پہل رائی کے برابر دکھائی دیتی ہے۔ بعد میں پہاڑ کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور آخر کار جیسے چمٹتی ہے۔ اس کی تباہی و بربادی کرتی رہتی ہے چھوا چھوت بھی اسی قسم کی چیز ہے۔ یہ چھوا چھوت غیر مذاہب کے متعلق دکھائی دیتی ہے۔ غیر فرقوں (سمپردایہ) کے متعلق دکھائی دیتی ہے۔ ایک ہی فرقہ (سمپردایہ) کے اندر بھی گھس گئی ہے۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ تو چھوا چھوت میں پھنسے ہوئے زمین پر بوجھ بن گئے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو ہی سمجھانے۔ اپنے کو ہی پالنے پوسنے نہانے۔ دھونے۔ کھانے۔ پینے سے فرصت ہی نہیں پاتے۔ ایشور کے نام پر ایشور کو بھول کر وہ اپنے کو ہی پوجنے لگ گئے ہیں لہذا چھوا چھوت کے انسداد کرنے والے کو صرف بھنگی اور چمار کو اپنانے پر ہی بس نہیں کرنی چاہیئے۔ بلکہ جب تک وہ ہر ایک جاندار (جیوماتر) کو اپنے جیسا نہ دیکھ لے۔ اور اپنے آپ کو ہر جاندار میں نہ سونپ دے۔ تب تک صبر نہ کرے۔ چھوا چھوت کے دور کرنے کا مطلب ہے۔ سارے سنسار کے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرنا۔ اس کا سیوک بننا۔ اس نظریہ سے دیکھنے پر انسداد چھوا چھوت بھی اہنسا کا ہم پلہ بن جاتا ہے۔ اور حقیقت میں وہ ہے بھی۔ اہنسا کے معنے ہیں تمام جانداروں کے ساتھ پریم۔ انسداد چھوا چھات کا بھی یہی مطلب ہے۔ جیو ماتر کا باہمی بھید مٹانا انسداد چھوا چھوت

کہلاتا ہے۔ اس شکل میں چھوا چھوت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقص لازمی طور پر تھوڑی بہت مقدار میں تمام روئے زمین پر پایا جاتا ہے۔ مگر اس مضمون میں ہم نے ہندو دھرم کے اندر گھسی ہوئی سڑاند کی شکل میں اس پر غور کیا ہے۔ کیوں کہ ہندو دھرم میں اسے دھرم کا رتبہ ملا ہوا ہے۔ اور دھرم کے بہانے لاکھوں یا کروڑوں انسانوں کی حالت غلاموں جیسی بنا ڈالی ہے۔

کایک پریشرم (جسمانی مشقت)

یارودہ جیل مورخہ ۱۶ ۹/۳۲

جسمانی مشقت (कायिक पारिश्रम) ہر ایک انسانی وجود کے لئے لازمی ہے۔ یہ بات پہلے پہل مجھے ٹالسٹائی کا ایک مضمون پڑھ کر ذہن نشین ہوئی۔ اتنا واضح طور پر اس بات کو سمجھنے سے پیشتر ہی میں نے اس پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیا تھا۔ رسکن (Ruskin) کا ان ٹو دی لاسٹ (Unto the Last) پڑھنے کے بعد فوراً ہی کایک پریشرم (جسمانی مشقت) انگریزی الفاظ "بریڈ لیبر" (Bread Labour) کا لفظی ترجمہ ہے۔ "بریڈ لیبر" کے لفظی معنے ہوتے ہیں۔ روٹی کے لئے مشقت۔ روٹی کے لئے ہر انسان کو مزدوری کرنی چاہیے۔ ہاتھ پیر ہلانے چاہیں۔ یہ ایشوریہ نیم (قانون الٰہی) ہے۔ یہ اصل دریافت ٹالسٹائی کی نہیں ہے

بلکہ اس کی نسبت بہت گمنام روسی مصنف بڑنوح کی ہے۔ اسے
ٹالسٹائی نے شہرت دے کر اپنایا۔ اس کا نمونہ میری آنکھیں بھگوت
گیتا کے تیسرے ادھیائے میں دیکھ رہی ہیں۔ یگیہ کئے بنا جو کھاتا
ہے۔ وہ چوری کا ان (اکھانا) کھاتا ہے۔ بغیر یگیہ کے کھانے والے پر
یہ سخت لعنت ہے۔ یہاں یگیہ کے معنے کا ایک پرشرم یا روٹی کے
لئے مشقت ہی مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ اور میری رائے کے
مطابق نکلتے بھی ہیں۔ خواہ کچھ معنے نکلتے ہوں۔ یہی ہمارے اس
برت (عہد) کی بنیاد ہے۔ عقل بھی اسی طرف ہماری رہنمائی کرتی ہے
جو مزدوری نہ کرے اُسے کھانے کا کیا حق ہو سکتا ہے، بائبل میں لکھا
ہے "اپنی روٹی تو اپنا پسینہ بہا کر کمانا اور کھانا" ایک کروڑپتی بھی
اگر پلنگ پر لیٹا رہے۔ اور اس کے منہ میں کوئی اور کھانا ڈالے تو وہ
کھائے۔ اس حالت میں وہ بہت دنوں تک نہ کھا سکے گا۔ اس
میں اس کے واسطے راحت یا خوشی بھی نہ رہ جائے گی۔ اس لیے
وہ ورزش کر کے بھوک پیدا کرتا ہے۔ مگر وہ کھاتا تو اپنے ہاتھ منہ
ہلا کر ہی ہے، ایسی حالت میں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ کہ
اگر اسی طرح کسی نہ کسی شکل میں شاہ و گدا سب کو جسمانی ورزش
کی ضرورت پڑتی ہی ہے۔ تو پھر روٹی کمانے کی ہی کسرت سب لوگ
کیوں نہ کریں؟ کسان سے ہوا کھانے یا کسرت کرنے کو کوئی نہیں
کہتا۔ اور دنیا کے نوے فیصدی سے بھی زائد لوگوں کا گذارہ کھیتی

باڑی پر ہی ہے۔ باقی ماندہ دس فیصدی انسان بھی ان کی پیروی کریں۔ تو دنیا میں کسقدر راحت کسقدر امن اور کس قدر صحت و تندرستی کا دور دورہ ہو سکتا ہے۔ اور کھیتی کے ساتھ عقل کا میل ہو جائے۔ تو کھیتی کے کام کی بے شمار مشکلات آسانی سے دور ہو جائیں مزید براں اگر جسمانی مشقت کے اس بے لوث اور پاکیزہ اصول پر سبھی کاربند ہو جائیں۔ تو اونچ۔ نیچ کا بھید کافور ہو جائے۔ موجودہ حالات میں تو جہاں اونچ۔ نیچ کی بُو تک بھی نہ تھی۔ یعنی "ورن بیوستھا" میں بھی وہ گھس گئی ہے۔ مالک اور مزدور کی تمیز تو ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ اور غریب امیر سے حسد کرتا ہے۔ اگر سب اپنی روٹی کے لئے خود محنت کریں۔ تو اونچ۔ نیچ کی تمیز مٹ جائے۔ اور پھر جو دولت مند بن جائیں گے۔ وہ اپنے آپ کو مالک تصور نہ کرتے ہوئے اس دولت کے محافظ یا ٹرسٹی مابنیں گے۔ اور اس کا استعمال بیشتر محض خدمت خلق کے لئے کریں گے۔ جسے اہنسا پر کاربند ہونا ہو۔ ستیہ کی پوجا کرنی ہو۔ برہمچریہ کو سبھاوک بنانا ہو اس کے لئے تو جسمانی مشقت رام بان (مشکل کشا) کا کام دیتی ہیں یہ مشقت دراصل کھیتی ہی ہے۔ لیکن آج تو حالت یہ ہے۔ کہ سب اسے نہیں کر سکتے۔ اس لئے کھیتی کا مقصد دل میں رکھ کر۔ آدمی اُس کے عوض میں دوسری مشقت جیسے کاتنا۔ بُننا۔ بڑھئی پن۔ لوہار پن۔ وغیرہ وغیرہ کر سکتا ہے۔ سب کو اپنا اپنا بھنگی تو بننا ہی چاہئے

جو کھاتا ہے۔ اُسے میلا پیدا تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ جو میلا پیدا کرے۔ وہی اپنے میلے (گندگی) کو گاڑے۔ یہ سب سے اچھی بات ہے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے۔ تو سارے کنبہ کو اپنا فرض ادا کرنا چاہیئے۔ مجھے تو برسوں سے ایسا معلوم ہوتا چلا آیا ہے۔ کہ جہاں کہیں بھنگی کا پیشہ الگ تسلیم کیا گیا ہے۔ وہاں کوئی نہ کوئی مہا دوش (نقص عظیم) پیدا ہو جاتا ہے۔ اس لازمی حفظان صحت کے کام کو نیچ سے نیچ پہلے پہل کس نے مانا ہوگا۔ اس کی تاریخ (اتہاس) ہمارے پاس نہیں ہے جس نے ایسا مانا ہے۔ اس نے ہم پر اپکار (احسان) ہرگز نہیں کیا۔ ہم سبھی بھنگی ہیں۔ یہ خیال ہمارے دلوں میں بچپن سے ہی پختہ ہو جانا چاہیئے۔ اور اسے مضبوط کرنے کا آسان ترین طریقہ یہ ہے۔ کہ جس کو ذہن نشین ہو گیا ہو۔ وہ آتم پرشرم (روحانی مشقت) کا آغاز پاخانہ صاف کرنے سے کریں۔ جو گیان پورک (جان بوجھ کر) ایسا کرے گا۔ وہ اس لحظہ سے دہرم کو الگ اور سچے معنوں میں سمجھنے لگ جائیگا۔ بچے۔ بوڑھے اور مرض سے اپاہج اگر مشقت نہ کریں۔ تو اسے کوئی قابل اعتراض نہ سمجھے بچے کی سمائی عمر ہیں ہو جاتی ہے۔ اور اگر بے قاعدگی نہ ہو تو بوڑھے اپاہج نہ ہو سکیں گے۔ اور مرض تو نزدیک آہی کیسے سکتا ہے؟

सर्व धर्म — सम भाव

مذہبی یکسانیت نمبر۱

باروده جیل مورخہ ۹/۳۰ ۲۳

اپنے برتوں میں جس برت (عہد) کو ہم سہشنتا (بردباری) کے نام سے جانتے ہیں۔ اسے یہ نیا نام دیا گیا ہے۔ سہشنتا (برداشت) انگریزی لفظ (Toleration) کا ترجمہ ہے۔ یہ مجھے پسند نہ آیا تھا۔ لیکن دوسرا لفظ سوجھتا نہ تھا۔ کاکا صاحب کو بھی یہ پسند نہ آیا تھا۔ انہوں نے "سرو دھرم آدر" (سب مذاہب کی عزت کرنا) لفظ سجھایا۔ مجھے یہ بھی اچھا نہ لگا۔ دوسرے دھرموں کو سہن کرنے میں ان میں کمزوری مان لی جاتی ہے۔ آدر میں کرپا (مہربانی) کا جذبہ جھلکتا ہے۔ اہنسا ہمیں دوسرے مذاہب کے متعلق یکسانیت کے بھاؤ سکھلاتی ہے۔ آدر اور سہشنتا (برداشت) اہنسا کے نکتہ خیال سے کافی نہیں ہیں۔ غیر مذاہب کے متعلق یکسانیت کے بھاؤ (جذبہ) کو رکھنے سے مول میں (بنیاد میں یا تہ میں) اپنے مذہب یا دھرم کی اپورنتا (ادھورا پن) کی قبولیت بھی پائی جاتی ہے۔ اور ستیہ (حق) کی جستجو و اہنسا کی کسوٹی یہی بات سکھلاتی ہے۔ مکمل حق (سمپورن ستیہ) اگر ہم نے دیکھا ہوتا

تو پھر تلاش حق (ستیہ کا آگرہ) کیسی ؛ تب تو ہم پرمیشور ہو گئے۔ کیوں کہ یہ ہماری بھاونا (اعتقاد) ہے۔ کہ ستیہ ہی پرمیشور ہے۔ ہم پورن ستیہ کو نہیں پہچانتے۔ اس لئے اس کا آگرہ (جستجو) کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے پرشارتھ (کوشش) کی گنجائش ہے۔ اس میں اپنی اپورنتا (ادھوراپن) آگیا۔ ہم ادھورے تو ہمارے تصور کردہ دھرم بھی ادھورے۔ سوتنتر دھرم سمپورن ہے۔ اسے ہم نے دیکھا نہیں۔ جس طرح ایشور کو ہم نے نہیں دیکھا۔ ہمارا مانا ہوا دہرم اپورن (نامکمل) ہے۔

مذکورہ بالا فقرہ کچھ غیر صاف ہے۔ اس لئے اس بارے میں مورخہ ۲۰ ۸/۳۸ کو مہاتما جی سے دریافت کیا گیا تھا۔ جس کا جواب مہاتما جی نے حسب ذیل دیا۔

نگن وادا وار دھا

۱۵/۹/۳۸

بھائی اشری ....

آپ کا پوجیہ گاندھی جی کے نام کا تاریخ ۲۰ ۸/۳۸ کا پتر ملا۔ پوجیہ گاندھی جی کے کہنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ ستیہ۔ اہنسا۔ برہمچریہ وغیرہ دھرم اچل (غیر مبدل) اور سناتن (قدیمی) ہیں۔ مگر مختلف مذاہب اور گنوں (اوصاف) میں ان کی جو عملی شکل دہرم کے نام پر رائج ہے۔ اس کو ہمیشہ کے لئے سچا اور پورن (مکمل) نہ ماننا

چاہیئے۔ اس میں درجہ بدرجہ درستی اور ترقی کے لئے گنجائش ہے مثلاً اگر شوچ (پاکیزگی) کے نام پر چھوا چھوت جاری ہوا ہے۔ اور وہ دھرم روپ مانی گئی ہو تو اس میں درستی ہونا لازمی ہوتا ہے۔

امید ہے اس تمثیل سے شک دور ہو جائے گا۔

آپ کا

کشوری لال

اور اس میں سدا تبدیلی آتی رہتی ہے۔ اور آتی رہے گی ایسا ہونے سے ہی ہم درجہ بدرجہ اونچے چڑھ سکتے ہیں۔

ستیہ کی طرف ایشور کی طرف دن بدن آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اور اگر انسان کے تصور کردہ سبھی مذاہب کو نامکمل مان لیں تو پھر کسی کو اونچا کسی کو نیچا ماننے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ سبھی سچے ہیں۔ مگر سبھی ادھورے ہیں۔ اس لئے نقص سے مبرا نہیں۔ یکسانیت کے بھاؤ ہونے پر بھی ہم اس میں نقص دیکھ سکتے ہیں۔ ہمیں اپنے میں بھی نقائص کو دیکھنا چاہیئے اس نقص کی وجہ سے اسے ترک نہیں کرنا چاہیئے۔ مگر نقص ضرور دور کرنا چاہیئے۔ اس قسم کے یکسانیت کے بھاؤ رکھیں۔ تو غیر مذاہب میں جو کچھ قابل قدر ہے۔ اُسے اپنے مذہب میں جگہ دینے میں تامل نہ ہونا چاہیئے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ویسا کرنا دھرم ہی ماننا چاہیئے۔

سبھی دھرم ایشور کے دئے ہوئے ہیں۔ مگر وہ انسان کے تصور میں آنے کے سبب۔ انسانوں کے ذریعہ ان کا پرچار ہونے کے سبب۔ وہ نامکمل ہوتے ہیں۔ ایشور کا دیا ہوا دھرم اگمیہ (باطنی) ہے۔ انسان اسے زبان سے ظاہر کرتا ہے۔ اس کے معنے بھی انسان بتلاتا ہے۔ کس کے معنے سچے سمجھے جائیں؟ سب اپنے اپنے نکتہ نگاہ سے جب تک وہ نکتہ نگاہ قائم رہے گا۔ تب تک سچے ہیں مگر سب کا جھوٹا ثابت ہونا بھی ناممکن نہیں ہے۔ اسی لئے ہمیں سب مذاہب کے متعلق یکسانیت کے خیالات رکھنے واجب ہیں اس سے اپنے دھرم کے متعلق لاپرواہی پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ اپنے دھرم کے ساتھ پریم اندھا پریم ہر دہ کر عقلمندانہ بن جاتا ہے۔ پہلے سے زیادہ ساتوک (سنجیدہ) اور نرمل (پاکیزہ) بنتا ہے۔ سب مذاہب کے متعلق یگانگت کا احساس پیدا ہونے پر ہی ہماری دویہ چکشو (اندرونی آنکھیں۔ چشم باطن) کھل سکتی ہیں۔ اندھے اعتقاد اور اندرونی روشنی میں شمال و جنوب جتنا فرق ہے دھرم گیان ہونے پر فرق یا اختلاف مٹ جاتے ہیں۔ اور یکسانیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ اس یکسانیت کے احساس کو وسیع تر کر کے ہم اپنے دھرم کو زیادہ پہچان سکتے ہیں۔

یہاں دھرم ادھرم کا بھید نہیں مٹتا۔ یہاں تو ان مذاہب کی بات ہے۔ جنہیں ہم نردھارت (الہامی) دھرم کی شکل میں

جانتے ہیں۔ ان سبھی مذاہب کے مول سدھانت (بنیادی اصول) ایک ہی ہیں۔ سبھی ہیں سنت عورت اور مرد ہو گذرے ہیں آج بھی موجود ہیں۔ اس لئے دھرموں کے متعلق یکسانیت کے احساس میں اور دھرموں کے پیرو کار انسانوں کے متعلق یکسانیت کے احساس میں کچھ فرق روا ہے۔ منشیہ ماتر (جملہ بنی نوع انسان) خواہ کوئی نیک ہو یا بد۔ خواہ کوئی مذہب کو ماننے والا ہو یا لا مذہب۔ سب کے متعلق یکساں طور پر یکسانیت کا احساس ہونا ضروری ہے۔ لیکن دھرم اور ادھرم کے متعلق یکسانیت کا احساس بالکل ناروا ہے۔

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ بہت سے دھرموں کی ضرورت کیا ہے؟ یہ ہم جانتے ہیں کہ دھرم بہت سے ہیں۔ آتما (روح) ایک ہے۔ مگر انسانی قالب بے شمار ہیں۔ قالب کی اسنکھیتا (لاتعدادیت) مٹانے سے مٹ نہیں سکتی۔ تاہم آتما (روح) کی یکسانیت کو ہم جان سکتے ہیں۔ دھرم کا مول (جڑ) ایک ہے۔ جیسے درخت کا۔ مگر اس میں پتے بے شمار ہیں۔

सर्व धर्म सम भाव

مذہبی یکسانیت ۲

یارودہ جیل ۹/۳۰ ۳۰

یہ مضمون اتنا اہم ہے۔ کہ اسے یہاں پھر زیادہ وضاحت سے لکھتا ہوں۔ اپنا کچھ تجربہ لکھدوں۔ شاید یکسانیت کے معنے زیادہ واضح ہوجائیں۔ یہاں کی مانند فنکس (جنوبی افریقہ) میں بھی روزانہ پرارتھنا ہوا کرتی تھی۔ وہاں ہندو۔ مسلمان اور عیسائی ہوتے تھے۔ آنجہانی سیٹھ رستم جی یا ان کے فرزند اکثر موجود رہتے تھے۔ سیٹھ رستم جی کو "مینے وہالوں دہالوں داوا رام جی کو نام" (مجھے رام نام بہت پیارا ہے) بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے۔ کہ ایک دفعہ مگن لال یا کاشی ہمیں گوا رہے تھے۔ سیٹھ رستم جی مستی میں بول اُٹھے۔ "داوا رام جی" کے بدلے "داوا ہور مجد" گائیے نا؛ گانے اور گوانے والوں نے تو اس پر اس طرح فوری عمل شروع کر دیا۔ گویا بالکل قدرتی جذبہ ہو۔ اس واقعہ کے بعد تو جب سیٹھ رستم جی موجود ہوتے، تب تو لازمی طور پر اور جب نہ ہوتے تو بھی کبھی کبھی "داوا ہور مجد" کے نام سے ہی گاتے۔ سیٹھ داؤ جی کا فرزند حسین تو عام طور پر آشرم میں ہی رہتا تھا۔ یہ پرارتھنا میں نہایت عقیدت سے شامل ہوتا۔ وہ خود بہت ہی سُریلی آواز میں "آرگن" (باجہ) کے ساتھ "ہے بہارِ باغ دنیا چند روز" گایا کرتا تھا۔ وہ بھجن (غزل) اس نے ہم سب کو سکھلا دیا تھا۔ اور وہ اکثر پرارتھنا میں گایا جاتا تھا۔ ہماری یہاں کی پرارتھنا مالا (بھجناولی) میں بھی اس کو جگہ دی گئی ہے۔ وہ صداقت پسند حسین کی یادگار ہے اس کے مقابلہ میں زیادہ مستقل اور مضبوط راست روی کا پابند نوجوان

میں نے نہیں دیکھا۔ جوزف رائے پین آشرم میں اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ انہیں ویشنو جن والا بھجن بہت پسند تھا۔ انہیں سنگیت (راگ موسیقی) کا اچھا گیان تھا۔ انہوں نے "ویشنو جن" کی بجائے "کرشچین جن تو تینے کہیئے" گا دیا۔ سب نے فوراً ان کا ساتھ دیا۔ میں نے دیکھا کہ جوزف کے آنند (خوشی) کی کوئی حد نہ رہی۔

ذاتی تسلی کے لیئے جب میں مختلف مذاہب کی کتابیں مطالعہ کر رہا تھا۔ تب میں نے عیسائی، اسلام، زردشت، یہودی اور ہندو اتنے دھرموں کی پستکوں کا اطمینانِ قلبی کی حد تک مطالعہ کیا تھا۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ اس مطالعہ کے وقت سبھی مذاہب کے متعلق میرے دل میں یکسانیت کے خیالات کام کرتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس وقت بھی مجھے اس بات کا علم تھا۔ اس وقت تو یکسانیت کے لفظ سے بھی مکمل واقفیت نہ ہوگی۔ تاہم اس وقت کے متعلق اپنے حافظہ کو تازہ کرتا ہوں تو مجھے یاد نہیں آتا کہ ان مذاہب کے متعلق نکتہ چینی کرنے کا ارادہ تک کبھی پیدا ہوا ہو۔ بلکہ ان کی کتابوں کو مذہبی کتابیں مان کر عزت کے ساتھ مطالعہ کرتا۔ اور سب میں بنیادی مستقل اصول ایک جیسے ہی پاتا تھا۔ کتنی ہی باتیں میں نہ سمجھ سکتا تھا۔ یہی بات ہندو مذہبی کتابوں کے متعلق بھی تھی۔ آج بھی کتنی ہی باتیں نہیں سمجھتا لیکن میں محسوس کرتا ہوں۔ کہ جسے ہم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ ضرور غلط ہے

ایسا ماننے میں جلد بازی سے کام لینا بھول ہے۔ بہت سی باتیں جو پہلے سمجھ میں نہ آئی تھیں۔ آج چراغ کی مانند روشن ہیں۔ یکسانیت کی مشق کرنے سے بہت سی گتھیاں اپنے آپ سلجھ جاتی ہیں۔ اور جہاں ہمیں نقائص ہی دکھائی دیں۔ وہاں انہیں جتلانے میں بھی جب عاجزی اور تمیز سے کام لیا جاتا ہے۔ تو کسی کو اس سے رنج نہیں پہنچتا۔

ایک مشکل شاید باقی رہ جاتی ہے۔ گذشتہ مضمون میں، میں نے لکھا تھا۔ کہ دھرم اور ادھرم میں تمیز رہتی ہے۔ اور کہ ادھرم (لامذہبیت) کے متعلق یکسانیت کا خیال رکھنے کی مشق کرنا مقصود نہیں ہے۔ اگر ایسا ہو تو دھرم اور ادھرم میں تمیز کرنے میں ہی کیا یکسانیت کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ نہ جائے گا؟ ایسا سوال اُٹھ سکتا ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے۔ کہ ایسی تمیز کرنے والا بھول بھی کر بیٹھے۔ لیکن اگر ہم میں حقیقی اہنسا (عدم تشدد) موجود رہے۔ تو ہم ویر بھاو (دشمنی کے خیالات) سے بچے رہتے ہیں۔ کیونکہ ادھرم دیکھنے پر بھی اس ادھرم پر چلنے والے کے متعلق تو پریم بھاؤ ہی ہوگا۔ اور ایسے رویہ سے وہ یا تو ہمارا نکتہ نگاہ قبول کرلے گا۔ یا ہمیں ہماری غلطی بتلا دے گا۔ یا دونوں ایک دوسرے کے اختلاف رائے کو برداشت کریں گے۔ آخر کار اگر مخالف اہنسک (عدم تشدد کا پابند) نہ ہوا۔ تو وہ سختی سے کام لے گا۔ اس حالت میں

بھی اگر ہم اہنسا پر صحیح معنوں میں کاربند ہوں گے۔ تو اس میں ذرا بھر بھی شک نہیں۔ کہ ہماری نرمی اس کی سختی کو دور کر ہی دے گی۔ غیر کو اس کی غلطی کے لئے بھی ہمیں گزند نہیں پہنچاتی ہے۔ بلکہ ہمیں خود ہی تکلیفات برداشت کرنی ہیں۔ اس سنہری اصول پر جو کاربند ہوتا ہے۔ وہ سبھی مشکلات کو حل کر لیتا ہے۔

नम्रता (نمرتا)

انکساری یا عاجزی

یاروودہ جیل مورخہ ۱/۳۰ ۔

اسے برتوں (عہدوں) میں الگ جگہ نہیں دی گئی۔ اور دی بھی نہیں جا سکتی۔ یہ اہنسا کا مترادف ہے۔ یا یوں کہیے۔ کہ اس کے اندر موجود ہے۔ مگر انکساری۔ نمرتا مشق (ابھیاس) سے پیدا نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ تو مزاج میں طبع زاد ہونی چاہیے۔ جب آشرم کی نیماولی (قواعد و ضوابط) پہلے پہل بنی۔ تب میں نے احباب کے پاس اس کا مسودہ بھیجا تھا۔ سر گوروداس بینرجی نے نمرتا کو برتوں رکھنے کی رائے دی تھی۔ اس وقت بھی میں نے اسے برتوں میں نہ رکھنے کی وہی وجوہات بتلائی تھیں۔ جو اب لکھ رہا ہوں۔ اگرچہ

برتوں میں اُسے جگہ نہیں دی گئی۔ تاہم برتوں کے مقابلہ میں وہ شاید زیادہ اہم ہے۔ ان کے مساوی اہمیت رکھنے والی تو یقیناً ہے۔ لیکن نمرتا کسی کو ابھیاس (مشق) سے حاصل ہوتی نہیں دیکھی گئی۔ ہنسیہ کی مشق (پریکٹس) ہوسکتی ہے۔ دیا (رحم) کا ابھیاس ہوسکتا ہے۔ لیکن انکساری کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ انکساری کی مشق کرنا بناوٹ یا مکر کی مشق کرنا ہے۔ یہاں نمرتا یا انکساری کا مطلب اس چیز سے نہیں ہے۔ جو بڑے آدمیوں میں ایک دوسرے کی عزت کے متعلق سکھائی پڑھائی جاتی ہے۔ کوئی بیرونی طور پر ایک دوسرے کو ماشٹانگ نمسکار کورنش بجالانا۔ لمبا لیٹ کر اظہار ادب کرنا) کرتا ہو۔ مگر دل میں اس کے متعلق نفرت بھری ہو۔ تو وہ نمرتا یا انکساری نہیں۔ بلکہ دہورت پن (پاکھنڈ یا مکاری) ہے۔ کوئی رام نام جپتا ہو۔ مالا پھیرتا ہو۔ منی جیسا بن کر سماج (سوسائٹی) میں بیٹھتا ہو۔ لیکن دل میں خود غرضی بھری ہو۔ تو وہ نمر (عاجز) نہیں۔ بلکہ پاکھنڈی ہے۔ منکسر المزاج (نمر) انسان خود نہیں جانتا۔ کہ وہ کس وقت نمر ہوتا ہے۔ ستیہ وغیرہ کی ناپ تول ہم کر سکتے ہیں۔ لیکن نمرتا کی نہیں کر سکتے۔ سوا بھاوک نمرتا (طبع زاد انکساری) چھپی نہیں رہتی۔ پھر بھی نمر انسان خود اُسے نہیں دیکھ سکتا۔

وششٹ اور وشوامتر کی مثال تو ہم نے اپنے آشرم میں

گئی بار سنی اور سمجھی ہے۔ ہماری اَہنکاری صفر درجہ تک پہنچ جانی چاہیے۔ ہم بھی کچھ ہیں۔ یہ بھوت سر پر سوار ہوا۔ کہ نمرتا مو اہو گئی۔ اور ہمارے سبھی برت (عہد و پیمان) مٹی میں مل گئے۔ برت پالن کرنے والا اگر اپنے دل میں برتوں کے پالن کرنے کا غرور رکھتا ہے۔ تو برتوں کی قیمت زائل ہو جاتی ہے۔ اور سوسائٹی میں ایسے برت بمنزلہ زہر ہو جاتے ہیں۔ اس برت کا فائدہ نہ سوسائٹی کو پہنچتا ہے۔ اور نہ خود عامل کو۔ نمرتا کے معنے ہیں انتہائی عدم خودی (اہم بھاو کا اتینت کھشیہ) غور کرنے پر معلوم ہوگا۔ کہ اس دنیا میں سارے جانداروں کی اہمیت ایک ذرہ بھر بھی نہیں ہے۔ جسمانی حالت میں ہم لوگ چند روز زندگی رکھتے ہیں۔ زمانہ (کال) کے بے انتہا چکر میں سو برس کا کیا شمار ہے؟ لیکن جب ہم اس چکر سے باہر ہو جائیں۔ یعنی "کچھ نہیں ہو جائیں" تو ہم سب کچھ ہو جائیں۔ اپنے کو کچھ ماننے کے معنے ہیں۔ ایشور سے پرماتما سے۔ ستیہ (حق) سے جدا ہو جانا۔ کچھ کا مٹ جانا پرماتما میں مل جاتا ہے۔ سمندر میں رہنے والا قطرہ سمندر کی عظمت کا حصہ دار بنتا ہے۔ لیکن اُسے اس کا علم نہیں ہوتا۔ سمندر سے الگ ہو کر جون ہی اس نے کچھ ہونے کا دعوےٰ کیا کہ سوکھا۔ اس زندگی کو پانی کے بلبلہ سے تمثیل دی گئی ہے۔ اس میں مجھے ذرا بھی مبالغہ معلوم نہیں ہوتا۔

ایسی نمرتا نیستی کی مشق کرنے سے کیسے حاصل ہو سکتی ہے؟ مگر برتوں کو ٹھیک طور پر سمجھ لینے سے نمرتا خود بخود آجاتی ہے ستیہ کا پالن کرنے والا (راہ حق پر چلنے والا) اہنکاری (مغرور) کیسے ہو سکتا ہے؟ دوسروں کے لئے جان قربان کرنے والا اپنے لئے جگہ کہاں گھیرنے جائے؟ وہ تو جس وقت جان قربان کر دینے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اسی وقت اپنے جسم کو الگ پھینک دیتا ہے کیا ایسی نمرتا پرشارتھ رہتتا (عدم سعی) نہیں کہی جا سکتی؟ ہندو دھرم میں ایسے معنے ضرور لئے گئے ہیں۔ اور اس سے آلسیہ (سستی) پاکھنڈ (مکاری) کے لئے بہت جگہ گنجائش پیدا ہو گئی ہے۔ حقیقت میں نمرتا کے معنے ہیں تیبر تم پرشارتھ (سعی بلیغ) لیکن وہ سب سعی یا کوشش پرمارتھ (مقصد حقیقی) کے لئے ہونی چاہیں ایشور خود چوبیسیوں گھنٹے لگاتار کام کیا کرتا ہے۔ انگڑائی لینے تک کی فرصت نہیں لیتا۔ ہم اس کے ہو جائیں۔ اس میں مل جائیں۔ تو ہماری کوششیں بھی اس کی مانند ہی غیر فانی ہو گئیں ہو جانی چاہیں۔ سمندر سے الگ رہنے والے قطرہ کے لئے ہم آرام کا خیال کر سکتے ہیں۔ مگر سمندر میں ملے ہوئے قطرہ کے لئے آرام کیسا؟ سمندر کو ایک لحظہ کے لئے بھی آرام کہاں ملتا ہے؟ ٹھیک یہی بات ہمارے متعلق بھی ہے۔ ایشور روپی سمندر میں ہم ملے کہ ہمارا آرام گیا۔ آرام کی ضرورت بھی جاتی رہی۔ یہی سچا آرام

ہے ۔ یہ مہا اشانتی (خلل عظیم) میں شانتی (امن) ہے ۔ لہذا سچی نمرتا ہم سے تمام ذی روحوں کی سیوا کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کی توقع رکھتی ہے ۔ سب کچھ سے فارغ ہوکر پھر ہمارے پاس نہ اتوار رہ جاتا ہے نہ شکروار نہ سوموار ۔ ایسی حالت کا بیان کرنا مشکل ہے ۔ لیکن اس کا احساس کیا جا سکتا ہے ۔ جنہوں نے سب کچھ قربان کیا ہے ۔ انہوں نے اس کا احساس کیا ہے ۔ ہم سب بھی محسوس کر سکتے ہیں ۔ یہی احساس پیدا کرنے کے مدعا سے ہی ہم لوگ آشرم میں اکٹھے ہوئے ہیں ۔ سبھی برت سبھی ارادے اس احساس کی خاطر ہی ہیں ۔ دیگر کاروبار کرتے ہوئے کسی دن یہ ہمارے ہاتھ لگ جائے گا ۔ اگر فقط اسی کی جستجو کی جائے ۔ تو وہ ملنا مشکل ہے ۔

سودیشی برت (عہد)

نوٹ :- پروچنوں میں (آتم اپدیشوں میں) "سودیشی" لکھنے کا وچار چھوڑ ہی دوں گا ۔ کیونکہ سیاسی مضامین کو نہ چھیڑنے کا جو ارادہ کر لیا ہے ۔ اس میں اس سے رکاوٹ پیدا ہوگی ۔ "سودیشی" پر محض دھارمک (مذہبی) نکتہ خیال سے لکھتے ہوئے بھی کچھ ایسی باتیں لکھنی ہی ہوں گی ۔ جن کا سیاسیات سے بلا واسطہ تعلق پیدا ہوتا ہے ۔

سودیشی برت (عہد) موجودہ زمانے کا مہاوست یعنی (عہد عظیم) ہے۔ جو چیز آتما (روح) کا دھرم (فرض) ہے۔ لیکن جہالت یا دیگر اسباب کی وجہ سے روح کو جس کا علم نہیں رہا۔ اس پر کاربند رہنے کے لئے برت (عہد) لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو مزاجاً گوشت خوری سے پرہیز کرتا ہے۔ اسے گوشت خوری ترک کرنے کے لئے کسی برت (عہد) لینے کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ گوشت اس کے لئے کشش کی چیز نہیں ہوتی۔ بلکہ اُسے تو گوشت دیکھ کر ہی الٹی (قے) آجاتی ہے۔

سودیشی آتما کا دہرم ہے۔ لیکن وہ بھولا ہوا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے متعلق برت (عہد) لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ آتما کے لئے سودیشی کے آخری معنے سب قسم کے جسمانی تعلقات سے مکمل مکتی (چھٹکارا) ہے۔ جسم بھی اس کے لئے پردیسی ہے کیونکہ جسم دیگر روحوں (آتماؤں) کے ساتھ تعلق جوڑنے میں رُکاوٹ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے راستہ میں سد راہ ہے۔ ہر ذی روح کے ساتھ یگانگت کا رشتہ جوڑتے ہوئے سودیشی دہرم کو جاننے اور نبھانے والا جسم کو بھی ترک کر دیتا ہے۔

اگر یہ معنے سچے ہیں۔ تو ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ اپنے پاس پڑوس کی سیوا میں مشغول ہوئے رہنا سودیشی دہرم ہے

ایسی سیوا کرنے سے دور والے باقی رہ جاتے ہیں۔ یا ان کو نقصان ہوتا ہے۔ ایسا شک پیدا ہونا ممکن ہے۔ لیکن وہ محض شک ہی شک ہے۔ سودیشی کی شدھ (خالص) سیوا کرنے میں پردیسی کی بھی شدھ سیوا ہو ہی جاتی ہے۔ جیسا پنڈ د ایں ویسا برہمانڈ میں یعنی اپنے گاؤں کی خدمت میں ساری دنیا کی خدمت شامل ہے۔ بخلاف اس کے دور کی خدمت کرنے کا پریم رکھنے میں وہ تو ہوتی نہیں۔ اور پڑوسی کی خدمت ترک ہو جاتی ہے۔ یوں تو نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے۔ دونوں بگڑتے ہیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھنے والے اپنے خاندان کے لوگ اور اپنے گاؤں کے لوگوں کو میں نے چھوڑ دیا۔ تو مجھ پران کا جو بھروسہ تھا۔ وہ بھی جاتا رہا۔ دور والوں کی سیوا کرنے جانے میں ان کی سیوا کرنے کا جس کا دہرم ہے۔ وہ اُسے بھولتا ہے۔ وہاں کا کرہ ہوائی بھی بگاڑا اور اپنا تو بگاڑ کر چلا ہی تھا۔ ایسے بے شمار حساب سامنے رکھ کر سودیشی دہرم ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اسی سے (स्वधर्मे निधनं श्रेयः परधर्मो भयावह) کے وراکیہ کی پیدائش ہوئی ہے اس کے معنے یوں کئے جائیں تو ٹھیک ہوں گے "سودیشی پر کاربند رہتے ہوئے اگر موت بھی ہو جائے تو اچھی۔ پردیشی تو ہمیشہ خطرناک ہوتی ہے۔" سوادہرم یعنے سودیشی۔

سودیشی کی حقیقت کو نہ سمجھنے میں ہی گڑبڑ ہوتی ہے اہل خاندان

کی ممتا میں پھنس کر میں اس کی پرورش کروں۔ اس کے لئے
دھن چراؤں یہ سودیشی نہیں ہے۔ مجھے تو ان کے متعلق میرا
جو دہرم (فرض) ہے۔ اُسے نبھانا ہے۔ اس دہرم یا فرض کی کھوج
کرتے اور اس پر چلتے ہوئے مجھے عالمگیر دہرم بھی دستیاب
ہو جاتا ہے۔ اپنے دہرم کو نبھاتے ہوئے غیر دھرمی کو یا غیر دہرم
کو کبھی نقصان پہنچ ہی نہیں سکتا۔ نہ ہی پہنچنا چاہیئے۔ اگر
پہنچ جائے تو مانا ہوا دہرم اپنا دہرم نہیں بلکہ وہ غرور ہے جسے
ترک کرنا ہی لازمی ہے۔

سودیشی پر کاربند ہوتے ہوئے خاندان کو قربان بھی کرنا پڑتا
ہے۔ مگر ویسا کرتے ہوئے بھی اس میں بھی خاندان کی خدمت کا جذبہ
ہونا چاہیئے۔ یہ عین ممکن ہے۔ جیسے اپنی قربانی دے کر اپنی حفاظت
کر سکتے ہیں۔ ویسے ہی خاندان کی دے کر اس کی حفاظت کر سکتے
ہیں۔ فرض کیجئے میرے گاؤں میں مہاماری (ہیضہ) پھیل گیا۔
اس بیماری کے چنگل میں پھنسے ہوؤں کی خدمت میں میں اپنے
آپ کو۔ اپنی بیوی کو، لڑکوں کو اور لڑکیوں کو لگا دوں۔ اور سبھی
اس مرض میں مبتلا ہو کر موت کے منہ میں چلے جائیں۔ تو میں نے خاندان
کی تباہی نہیں کی بلکہ اس کی خدمت کی ہے۔ سودیشی میں خود
غرضی نہیں ہے۔ اگر ہے تو وہ خالص شکل میں ہے۔ شدھ خود غرضی
کے معنے راہ معرفت (پرمارتھ) اور شدھ سودیشی کے معنے راہ

معرفت (پرمارتھ) کی انتہائی منزل ۔

اس سلسلہ خیالات کے مطابق میں نے کھادی (کھدر) میں مجلسی شدہ سودیشی دہرم پایا۔ سبھی کو یکساں طور پر جس کے بنھانے کی سخت ضرورت پڑے۔ ایسا اس زمانہ میں اس دیش میں کونسا سودیشی دہرم ہو سکتا ہے، جس پر بھولے سے کاربند ہونے سے بھی ہندوستان کے کروڑوں کی حفاظت ہو سکتی ہے ایسا کون سا سودیشی دہرم ہو سکتا ہے، ان سوالات کے جواب میں مجھے چرخہ اور کھدر دستیاب ہوا۔

کوئی یہ نہ خیال کرے کہ اس دہرم پر کاربند ہونے سے پردیشی مل والوں کو نقصان ہوتا ہے۔ چور کی چرائی ہوئی چیز واپس کرنی پڑے۔ یا اسے چوری کرتے روکا جائے۔ تو اس میں اس کا نقصان نہیں فائدہ ہی ہے۔ پڑوسی شراب پینا یا افیم کھانا چھوڑ دے تو اس میں کلال کو یا افیون کے ٹھیکہ دار کو نقصان نہیں فائدہ ہے وہ نامناسب طریقوں سے جو اپنی مطلب براری کرنے لگیں۔ اور ان کے یہ نامناسب طریقے چھوٹ جائیں۔ تو انہیں اور دنیا کو دونوں کا اس میں فائدہ ہی ہے۔

مگر جو لوگ چرخہ کے ذریعہ جیسا تیسا سوت کات کر، کھدر پہن پہنا کر، سودیشی دہرم پر مکمل عمل ہو گیا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ وہ سخت غلطی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ کھادی تو سامابک (مجلسی)

سودیشی کی پہلی سیڑھی ہے۔ اس سودیشی دھرم کی حد بندی نہیں ہے ایسے کھادی دھاری دیکھے گئے ہیں۔ جو اور سب سامان پردیشی رکھتے ہیں۔ انہیں سودیشی پر کاربند نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ تو رو میں بہنے والے ہیں۔ سودیشی کے عہد کو نبھانے والا برابر اپنے آس پاس پڑتال کرے گا۔ اور جہاں جہاں پڑوسی کی سیوا کی جا سکتی ہے۔ یعنی جہاں جہاں اس کے ہاتھ کا تیار کیا ضروری مال ہو گا۔ وہاں وہاں دوسروں کے مقابلہ میں اس کو ترجیح دے گا۔ پھر خواہ سودیشی چیز بھلے مہنگی اور کم درجہ کی ہو۔ عہد لینے والا اُسے سدھارنے اور سدھروانے کی کوشش کرے گا۔ بزدلوں کی مانند یہ کہہ کر کہ سودیشی خراب ہے۔ لہذا بدیشی استعمال میں نہیں لانے لگ جائے گا۔

مگر سودیشی دھرم جاننے والا اپنے کنوئیں میں ڈوبے گا نہیں جو چیز سودیش میں نہیں بنتی۔ یا سخت تکلیف سے ہی بن سکتی ہے۔ وہ پردیس سے دشمنی کے خیال سے اپنے دیش میں بنائے بیٹھ جائے تو اس میں سودیشی دھرم نہیں ہے۔ سودیشی دھرم نبھانے والا کبھی پردیش سے دشمنی کرے گا ہی نہیں لہذا مکمل سودیشی میں کسی کی مخالفت نہیں یہ تنگدلانہ دھرم نہیں ہے۔ یہ پریم و محبت میں سے۔ اہنسا و عدم تشدد میں سے پیدا شدہ خوبصورت دھرم ہے۔

برت (عہد) لینے کی ضرورت

یارودہ جیل مورخہ ۱۰/۳ ۱۴

برت (عہد) کی عظمت کے بارے میں، میں اس سلسلہ مضامین میں جہاں کہیں کچھ نہ کچھ لکھ چکا ہوں گا۔ لیکن برت زندگی کو منظم بنانے کے لیئے کس قدر ضروری ہے۔ اس پر بھی غور کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ برتوں کے متعلق تو میں پہلے تحریر کر ہی چکا ہوں۔ آؤ اب اس بات پر وچار کریں۔ کہ برتوں کی ضرورت کیا ہے؛

ایک سوسائٹی ہے۔ اور وہ زبردست ہے۔ وہ کہتی ہے۔ "فلاں فلاں نیموں (قواعد) کی پابندی لازمی ہے۔ لیکن اس کے متعلق برت (عہد) لینے کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ایسا کرنا دل کی کمزوری کا مظہر ہے۔ اور نقصان دہ بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اگر برت لینے کے بعد کوئی قاعدہ یا نیم اڑچن پیدا کرنے والا یا گناہ کی شکل میں نمودار ہو جائے۔ تو بھی اُسے نبھانا پڑے۔ یہ تو بالکل ناقابل برداشت ہے۔ وہ مثال دیتے ہیں۔ کہ فرض کرو شراب نہ پینا اچھا ہے۔ اس لئے اُسے نہ پینا چاہیئے لیکن اگر کسی وقت پی لی جائے۔ تو اس میں کیا خرابی ہے؟ دوائی کے طور پر تو اِسے پینا ہی پڑتا ہے۔ لہذا اُسے نہ پینے کا برت

لینا اپنے ہاتھ، پاؤں کٹا دینے کی مانند ہے۔ جو بات شراب کے متعلق کہی جا سکتی ہے۔ وہی دیگر باتوں کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ جھوٹ بھی بھلائی کے لئے کیوں نہ بولا جائے۔"

مجھے ان دلائل میں جان نظر نہیں آتی۔ برت (عہد) کے معنے ہیں اٹل نشچیہ (ارادہ)۔ اڑچنوں کو پار کر جانے کے لئے ہی تو برتوں کی ضرورت ہے۔ مشکلات برداشت کرنے پر بھی جو نہ ٹوٹے۔ وہی اٹل ارادہ کہلا سکتا ہے۔ ساری دنیا کا تجربہ شاہد ہے۔ کہ ایسے مستقل ارادہ کے بنا کوئی شخص درجہ بدرجہ نہیں اٹھ سکتا۔ جو پاپ یا گناہ ہو اس کے متعلق ارادہ برت نہیں کہلاتا۔ وہ تو راکششی ورتی (شیطانی ارادہ) ہے۔ مزید براں کوئی خاص ارادہ جو پہلے نیک دکھائی پڑتا ہو۔ اور آخر کار بد ثابت ہو تو اسے چھوڑنے کا ثواب ضرور حاصل ہوتا ہے۔ لیکن ایسی بات کے لئے کوئی برت یا عہد نہیں لیتا۔ لینا چاہئے بھی نہیں۔ جو مسلّمہ دھرم خیال کیا جاتا ہے۔ مگر جس پر کاربند ہونے کی ہمیں عادت نہیں پڑی۔ اسی کے متعلق برت لینا مناسب ہے۔

مذکورہ بالا مثال میں تو پاپ کی آمیزش ممکن ہے۔ راست گو کبھی یہ سوچنے نہیں بیٹھتا۔ کہ سچ بولنے سے کسی کو نقصان تو نہ ہوگا۔ اُسے خود یہ یقین رکھنا لازمی ہے۔ کہ راستی سے دنیا میں کسی کا نقصان نہیں ہوتا۔ اور ہو سکتا بھی نہیں۔ شراب خوری

کے متعلق بھی یہی بات ہے۔ یا تو برت لیتے وقت ہی اس میں دوائی کے طور پر استعمال کی گنجائش رہنے دینا چاہیئے۔ یا پھر جسم و جان کی جوکھم سہنے کے لیئے بھی تیار رہنا چاہیئے۔ دوا کے طور پر بھی شراب نہ پینے سے جسم اگر نہ رہا تو کیا ہوا؟ شراب پینے سے جسم لازمی طور پر بچ رہیگا یہ گارنٹی کون دے سکتا ہے؟ اگر اس وقت جان بچ بھی گئی۔ مگر دوسرے وقت کسی دیگر وجہ سے جاتی رہی تو اس کی جوابدہی کس کے سر ہوگی؟ بخلاف اس کے زندگی کی حفاظت کے لیئے بھی شراب نہ پینے کی مثال کا اثر شراب خوری میں پھنسے ہوئے لوگوں پر جو پڑے گا۔ اس کا دنیا کو کس قدر لابھ پہنچے گا؟ جان جائے یا رہے مجھے تو دیرم پر کاربند رہنا ہی ہے۔ ایسا مستحکم ارادہ کرنے والوں کو ہی کسی، وقت ایشور (خدا) کا وصال نصیب ہو سکتا ہے۔ برت (عہد) لینا کمزوری کا نشان نہیں۔ بلکہ مضبوطی کا نشان ہے۔ فلاں کام کرنا مناسب ہے۔ تو پھر کرنا ہی ہوگا۔ اسی نشچیہ (ارادہ) کا نام ہی برت ہے۔ اور اس میں طاقت ہے۔ اگر اُسے برت کا نام نہ دے کر کسی اور نام سے پکاریئے۔ تو اس میں کیا اعتراض ہے؟ لیکن "جہاں تک ممکن ہوگا کروں گا" ایسا کہنے والا اپنی کمزوری یا غرور کا ثبوت دیتا ہے۔ وہ خود بیشک اُسے نمرتا (عاجزی وانکساری) کا نام دیتا رہے۔ حقیقتاً اُس میں انکساری کی بُوتک بھی نہیں ہے

میں نے تو اپنے وہمنوں کے جیون میں دیکھا ہے۔ کہ "جہاں تک ممکن ہو۔" کا فقرہ نیک ارادوں میں زہر کے مانند ثابت ہوا ہے۔ "جہاں تک ہو سکے وہاں تک کرنا" کے معنے ہیں پہلی ہی مشکل کے سامنے گر پڑنا۔ "جہاں تک ہو سکے گا سچائی پر کاربند رہوں گا" اس فقرہ کے کوئی معنے ہی نہیں ہیں۔ تجارتی کاروبار میں بھی "جہاں تک ممکن ہو گا فلاں تاریخ کو اتنی رقم ادا کر دی جاوے گی" کے الفاظ جس چٹھی، چیک یا ہنڈی میں درج ہوں۔ وہ منظور نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح جہاں تک ہو سکے گا۔ وہاں تک سچائی پر کاربند ہونے والوں کی ہنڈی بھگوان (خدا) کی دوکان میں منظوری حاصل نہ کر سکے گی۔

ایشور بذات خود (ذات الٰہی) مستقل ارادے کی۔ برت یا عہد کی مکمل تصویر ہے۔ اس کے نیم (قاعدہ یا قانون) میں ذرا بھر بھی اِدھر اُدھر ہو جائے۔ تو اس کی خدائی ہی نہ رہے۔ آفتاب مہاورت دھاری (سب سے بڑا عہد لینے والا) ہے۔ اسی سے دنیا میں زمانہ کا قیام ہے (وقت کی ہستی قائم ہے) اور خالص پنچانگ (تنتھیاں۔ پھل پھول دینے) کی پرورش ہوتی ہے۔ اس نے اپنی یہ ساکھ بنائی ہے کہ وہ سدا نمودار ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اور اسی وجہ سے ہم لوگ اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتے ہیں۔ سبھی قسم کے بیوپار کی بنیاد ایک ٹیکی پر نگیا (عہد) ہی ہوتا ہے۔ بیوپاری ایک

دوسرے کے ساتھ وعدوں سے بندھے ہوئے نہ ہوں۔ تو بیوپار ہی نہ چلے۔ اس طرح برت (عہد) ایک عالمگیر چیز دکھائی دیتی ہے۔ تو پھر جہاں اپنے جیون کو باندھنے کا سوال پیدا ہو۔ جہاں ایشور درشن (وصال ایزدی) کا سوال ہو۔ وہاں برت (عہد) کے بنا کیسے کام ہو سکتا ہے۔ لہذا برت کی ضرورت کے متعلق ہمارے دل میں کبھی شک و شبہ پیدا ہونا ہی نہ چاہئے۔

ضروری ضوابط

[مہاتما گاندھی جی کے آشرم کی نبھاولی (قواعد و ضوابط) میں برت (عہد) لینے والوں کی ہدایت کے لئے حسب ذیل ضوابط و تصریحات درج کی گئی ہیں۔]

ا۔ سچائی۔ ستیہ

عام کاروبار میں جھوٹ نہ بولنا یا جھوٹ پر کاربند نہ ہونا صرف اتنا ہی سچ کا مطلب نہیں۔ بلکہ سچ ہی خدا (پرمیشور) ہے۔ اور اس کے سوا دوسرا کچھ نہیں ہے۔ اس سچ کی تلاش اور عبادت کے لئے باقی سارے قواعد و ضوابط کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسی میں سے ان کی پیدائش ہے۔ اس سچ کو پہچاننے والا اپنے

مفروضہ ملکی مفاد کے لئے بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ جھوٹ پر کار بند بھی نہیں ہوتا۔ سچائی کی خاطر وہ پرہلاد کی مانند ماتا پتا وغیرہ بزرگوں کے احکامات کو بھی عجز و انکساری کے ساتھ ماننے سے انکار کر دینا اپنا دھرم سمجھتا ہے۔

۲۔ اہنسا عدم تشدد

جانداروں کا خون نہ بہانا۔ صرف اتنا ہی اس برت (عہد) کو نبھانے کے لئے کافی نہیں ہے۔ اہنسا کے معنے چھوٹے سے چھوٹے جنتوں سے لے کر منیشہ (انسان) تک سبھی جانداروں کے ساتھ یکسانیت کا احساس و برتاؤ رکھنے کے ہیں۔ اس عہد کو لینے والے کے لئے لازم ہے۔ کہ وہ سخت سے سخت بے انصافی کرنے والے پر بھی غصہ نہ کھائے۔ بلکہ اس کے ساتھ محبت آمیز رویہ رکھے۔ اس کی بہتری چاہے اور کرے۔ مگر محبت کرتا ہوا بھی بے انصاف انسان کی بے انصافی کے قابو میں نہ آوے۔ بے انصافی کی ہمیشہ مخالفت کرے۔ اور ایسا کرنے میں وہ جو تکلیفات دے۔ وہ حوصلہ سے اور بے انصاف انسان سے نفرت کئے بغیر برداشت کرے۔

۳ - برہمچریہ - تجرد

برہمچریہ (تجرد) پر کاربند ہوئے بغیر مذکورہ بالا عہدوں (برتوں) کا پورا کرنا ناممکن ہے۔ برہمچاری (مجرّد) کبھی کسی مرد عورت پر بری نگاہ نہ ڈالے۔ اتنا ہی صرف کافی نہیں۔ بلکہ دل میں بھی برائی کا خیال تک پیدا نہ ہو۔ اور شادی شدہ ہو تو اپنی بیوی یا خاوند کے ساتھ بدفعلی نہ کرے۔ بلکہ اسے دوست سمجھ کر اس کے ساتھ پاکیزہ تعلقات رکھے۔ اپنی یا دوسری عورت کا یا اپنے خاوند کا یا غیر مرد کا برے خیال سے چھونا اور اس کے ساتھ بری گفتگو کرنا یا دیگر بدکاری کی کوشش کرنا بھی ٹھوس برہمچریہ کو توڑنا ہے۔ مرد مرد ہیں یا عورت عورت ہیں۔ یا دونوں کی چیز کے متعلق بدفعلی کی کوشش کرنا بھی ٹھوس برہمچریہ کو توڑنا ہوتا ہے۔

۴ - اسواد - مزے سے پرہیز

انسان جب تلک زبان کے مزے پر قابو نہ پالے۔ تب تلک برہمچریہ پر کاربند رہنا سخت دشوار ہے۔ یہی محسوس کرنے کی وجہ سے اسواد (مزے سے پرہیز) کو ایک الگ برت (عہد) کی شکل دی گئی ہے۔ خوراک صرف زندگی کا زادراہ سمجھ کر ہی

لینی چاہیئے۔ اُسے دوائی سمجھ کر باقاعدہ طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ اس برت کا لینے والا خرابی پیدا کرنے والے مصالحہ جات وغیرہ سے پرہیز رکھے۔ گوشت خوری، شراب نوشی۔ تمباکو۔ بھنگ وغیرہ کا استعمال آشرم میں منع ہے۔ اس برت کو لینے والوں کے لئے دعوتوں کا یا خوراک کے لئے زیادہ رغبت رکھنے کی ممانعت ہے۔

۵۔ استیہ۔ چوری نہ کرنا

دوسرے کی چیز اس کی اجازت بغیر نہ لینا۔ صرف اتنا ہی اس برت پر کاربند رہنے کے لئے کافی نہیں۔ جو چیز جس استعمال کے لئے ہمیں ملی ہو۔ اسے کسی دوسرے استعمال میں لانا یا جتنے وقت کے لئے ملی ہو۔ اس کی نسبت زیادہ وقت کے لئے استعمال میں لانا بھی چوری ہے۔ اس برت کی تہ میں گہری سچائی تو یہ ہے۔ کہ پرماتما (خدا) جانداروں کے لئے روزانہ ضروریات کی اشیاء ہی روزانہ پیدا کرتا ہے۔ اور دیتا ہے۔ اس سے زیادہ بالکل پیدا نہیں کرتا۔ اس لئے اپنی کم سے کم ضروریات سے زائد جو کچھ بھی انسان لیتا ہے۔ وہ چوری کرتا ہے۔

۶۔ اپری گرہ۔ قناعت

اپری گرہ (قناعت) تو استیہ (چوری نہ کرنا) کے اندر ہی آجاتا ہے۔ غیر ضروری چیز جیسے لی نہیں جا سکتی۔ ویسے اسے جمع بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا جس خوراک یا ساز و سامان کی ضرورت نہیں ہے۔ اُسے اکٹھا کرنا اس برت کی خلاف ورزی ہے۔ جس کا کرسی بنا کام چل سکتا ہے۔ وہ کرسی نہ رکھے۔ اپری گرہ پر کاربند ہونے والا (قانع) اپنی زندگی ہمیشہ سادہ بناتا چلا جائے۔

۷۔ کایک پرشیرم۔ جسمانی مشقت

استیہ اور اپری گرہ (چوری سے پرہیز اور قناعت) پر کاربند ہونے کے لئے جسمانی مشقت (کایک پرشیرم) پر کاربند ہونا لازمی ہے۔ علاوہ ازیں اگر بنی نوع انسان اپنا گذارہ جسمانی مشقت سے کریں۔ تو ہی وہ مجلسی اور ذاتی دغا سے بچ کر رہ سکتے ہیں۔ جس کے اعضائے بدنی کار آمد ہیں۔ اور جسے اس اصول کی سمجھ آگئی ہے۔ ایسے تمام عورت مردوں کو اپنا تمام روزانہ کام جس کے پورا کرنے کی قابلیت ان میں موجود ہو۔ اُسے پورا کر لینا چاہیے۔ اور غیر سے خدمت کا کام

بلا وجہ نہ لینا چاہئے۔ مگر بچے اپاہج اور بوڑھے عورت مردوں کی سیوا کا موقع ملے۔ تو ساماجک ذمہ داریوں (فرائض) کو سمجھنے والے ہر ایک انسان کو اسے سرانجام دینا واجب ہے۔

اس اصول کے مطابق آشرم میں مزدور سے صرف وہی کام لیا جاتا ہے۔ جو اور کسی طریقہ پر سرانجام نہ ہو سکتا ہو۔ پھر بھی اس کے ساتھ مالک و نوکر کا سا سلوک روا نہیں رکھا جاتا۔

۸۔ سودیشی

انسان سرب شکتیمان (قادر مطلق) نہیں ہے۔ لہذا وہ اپنے پڑوسی کی سیوا کرنے سے ہی سارے جہان کی خدمت کرتا ہے۔ اس جذبہ کا نام سودیشی ہے۔ جو اپنے نزدیک والوں کی سیوا چھوڑ کر دور والوں کی سیوا کرنے یا لینے دوڑتا ہے۔ وہ سودیشی کو توڑتا ہے۔ اسی جذبہ کے وسیع ہونے سے تمام دنیا میں ایک عمدہ نظام قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس کو توڑنے سے بد نظمی پھیلتی ہے۔ اس نیم کے مطابق جہاں تک ممکن ہو سکے ہمیں اپنے پڑوسی کی دوکان سے ہی لین دین رکھنا چاہئے دلیش میں جو چیز ہوتی ہے۔ اور آسانی سے ہو سکتی ہے۔ وہ چیز ہمیں پردیش سے نہ منگانی چاہئے۔ سودیشی میں خودغرضی

کے لئے گنجائش نہیں ہے۔ اپنے کو کنبہ کے لئے۔ کنبہ کو شہر کے لئے۔ شہر کو دیش کے لئے اور دیش کو دنیا کی بہتری کے لئے قربان کرنا پڑتا ہے۔

۹۔ ابھے (بے خوفی)

ستیہ۔ اہنسا وغیرہ برتوں کو پورا نبھانا بغیر نربھینا (بےخوفی) ناممکن ہے۔ اور موجودہ زمانہ میں تو ہر جگہ خوف ہی خوف دکھلائی دیتا ہے۔ ایسی حالت میں بے خوفی کو سیکھنا اور سکھانا لازمی جان کر اُسے برتوں (عہدوں) میں جگہ دی گئی ہے۔ جو سچائی پر کاربند رہنا چاہتا ہے۔ اُسے نہ تو جات پات سے ڈرنا چاہئے اور نہ سرکار سے ڈرنا چاہئے۔ نہ چور سے ڈرنا چاہئے۔ نہ غریبی سے ڈرنا چاہئے۔ نہ ہی موت سے ڈرنا چاہئے۔

۱۰۔ اسپرشیتا نوارن۔ انسداد چھوا چھوت

ہندو دھرم میں چھوا چھوت کے رواج نے جڑ پکڑی ہوئی ہے اس میں دھرم نہیں بلکہ ادھرم ہے۔ ایسا ماننے کی وجہ سے انسداد چھوا چھات کو نیموں میں جگہ دی گئی ہے۔ اچھوت کہلانے والوں کے لئے آشرم میں دوسری ذاتوں کے مساوی ہی حقوق ہیں۔

آشرم جاتی بھید (ذات پات کی تمیز) کو نہیں مانتا۔ یہ مانا جاتا ہے۔ کہ ذات پات کی تفریق سے ہندو دھرم کو نقصان پہنچا ہے اس میں جو اونچ نیچ اور چھوا چھات کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ وہ زہر قاتل ہے۔ آشرم ورن آشرم دھرم کو مانتا ہے۔ اس میں روا رکھی گئی۔ ورن ویوستھا کام کاج (پیشہ) کے ماتحت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس ورن نیتی کے مطابق ماں باپ کے پیشہ سے ہی روزگار حاصل کر کے باقی وقت علم حقیقی کے حصول اور ترقی میں گذارنا چاہیئے۔ سمرتیوں (ہندو دھرم شاستروں) میں بیان کی گئی۔ آشرم ویوستھا دنیا بھر کے لئے مفید ہے۔ مگر ورن آشرم دھرم قابل قبول ہونے پر بھی چونکہ آشرم کی زندگی کے مقصد کی بنیاد گیتا میں بیان کردہ وسیع اور بھگتی سے پُر سنیاس پر رکھے جانے کے سبب۔ آشرم میں ورن بھید کے لئے گنجائش نہیں ہے۔

۱۱۔ سہشنتا (بردباری)

آشرم کا عقیدہ ہے۔ کہ دنیا بھر میں رائج الوقت مشہور مشہور دھرم سب سچائی کو پھیلانے والے ہیں۔ مگر وے سب نامکمل انسان کے ذریعہ ہوئے ہیں۔ اس لئے سب میں ادھوراپن یا غیر سچائی کی ملاوٹ ہو گئی ہے۔ لہذا ہمیں جس طرح اپنے

دھرم کے لئے عزت ہے۔ اسی طرح غیر کے دھرم کے لئے بھی عزت کے جذبات ہونے چاہیں۔ جہاں ایسی بردباری پائی جاتی ہو۔ وہاں ایک دوسرے کے دھرم کی مخالفت ممکن نہیں ہوتی نہ ہی غیر مذہب والے کو اپنے مذہب میں لانے کی کوشش کرنا ممکن ہے۔ بلکہ سب دھرموں میں جو دوش (نقائص) ہیں۔ وہ دور ہوں۔ ایسی ہی پرارتھنا (دعا) اور ایسے ہی جذبات ہمیشہ ہونے چاہیں۔

باب پنجم

گاؤں کا کام

(از شری ونوبا بھاوے جی)

نوٹ :۔ شری ونوبا بھاوے وہ محب وطن ہیں جنہیں گاندھی جی نے اپنے پُرامن ستیاگرہ کے لئے سب سے پہلے سپاہی کے طور پر منتخب کیا ہے۔

عدم تعاون کی تحریک کے وقت سے گاؤں کی طرف لوگوں کا دھیان کھنچا ہے۔ گاؤں کی اہمیت سمجھ میں آنے لگی ہے۔ کتنے ہی سیوک گاؤں میں کام بھی کرنے لگے ہیں۔ اور کچھ کو اس میں کامیابی بھی ہوتی ہے۔ پر بہتوں کو کامیابی نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے تعلیم یافتہ طبقہ کی نظر گاؤں کی طرف گئی ہی

نہیں تھی۔ پہلے تو نظر دوسروں کی طرف تھی۔ مثلاً انگلستان کے لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا چاہئے۔ سرکار کو حالت سمجھانی چاہئے۔ وغیرہ بعد کو نگاہ اپنوں کی طرف پھری شہروں کی طرف اور تعلیم یافتہ لوگوں کی طرف۔ تعلیم یافتہ لوگوں میں قومی خیالات کے پرچار کرنے کے خیال کی بنا پر ساری جدوجہد چلائی جاتی تھی۔ عدم تعاون کے زمانہ میں گاؤں کی طرف نظر گئی۔ آگے بڑھے تو تعمیری پروگرام کے اندولن (جدوجہد) میں گاؤں میں داخل ہونے لگی۔ گاؤں والوں کی خدمت کرنے کی خواہش ہوئی۔ اور جو تھوڑا بہت نتیجہ سامنے ہے۔ وہ اسی خواہش کا نتیجہ ہے۔ اتنے برسوں کے لمبے تجربہ کے بعد ہمیں سوجھی "تیرا سائیں تیرے پاس کیوں بھٹکے سنسار میں"۔ یعنی کام فوراً شروع کر دینے کی وجہ سے بہت سی جگہ گاؤں کا کام ناکام ہوا ہے۔

اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ شروع شروع میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ ناامیدی کی کوئی وجہ نہیں۔ نہ ناامید ہونے والی حالت ہی ہے۔ وجہ یہ کہ کچھ گاؤں میں تجربے کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ اس کے سوا جو تجربے ناکامیابی ظاہر کرتے ہیں دراصل ناکامیاب نہیں ہوئے۔

پتھر توڑتے وقت پہلی چوٹ فالتو سی جان پڑتی ہے۔ لیکن

اس کا نتیجہ تو ہوتا ہی ہے ۔ اس مثال میں توڑا جانے والا پتھر گاؤں کی خلقت کو نہیں بتایا گیا ۔ بلکہ وہ اشارہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کا علیحدہ دل ہے ۔

اب ہمارے من میں گاؤں میں جانے کی بات تو آنے لگی ہے ۔ لیکن ہم گاؤں میں اپنے شہری ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ جانا چاہتے ہیں ۔ اس سے ہمارا کام ہونا نہیں ہے ۔ گاؤں میں گاؤں والوں جیسا بن کر رہنا چاہیئے ۔ یہ ہماری کامیابی کی خاص وجہ ہے ۔ گاؤں میں گیا ہوا تعلیم یافتہ آدمی آج بھی گاؤں کا نہیں بن سکا ۔ وہاں وہ پرویکار کے زعم میں آجاتا ہے ۔ اُسے گاؤں والوں سے خود کچھ سیکھنا ہے ۔ اس بات کو وہ بھول جاتا ہے ۔ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچارے جہالت کا شکار ہو کر اپنے دن گذار رہے ہیں ۔ اپنی انتہائی جہالت کا اسے احساس نہیں ۔ اور اپنے آپ کو اُسے کیسے سدھارنا ہے ۔ اُسے بھلا کر وہ لوگوں سے کام لینے کے پھیر میں پڑ جاتا ہے ۔ اسی وجہ سے وہ بالکل الگ تھلگ رہتا ہے ۔

(۱) اپنی نئی تہذیب کی عادتیں چھوڑ کر ہمیں گاؤں میں جانا چاہیئے ۔

(۲) گاؤں والوں کو تعلیم دینے کی خواہش لے کر نہیں جانا چاہیئے ۔

(۳) اپنے آپ کو کام میں لگانا چاہیے۔

یہ تین اہمیت کی باتیں ہمیں ہمیشہ دھیان میں رکھنی چاہیں ایسا دیکھا جاتا ہے۔ کہ کئی بار کوئی آدمی کسی گاؤں میں جا بیٹھتا ہے۔ اور ایک کام جو گاؤں کی امداد کے بغیر وہ کر سکتا ہے۔ اُسے سارے گاؤں میں ہلچل مچا کر بھی نہیں کر سکتا۔ اپنے کام کا ہر لمحہ کا اُسے پورا حساب رکھنا چاہیئے۔ گاؤں کے لوگوں کی نگاہ میں کام کرنے والے کی عزت ہوتی ہے۔ جو تہذیب یافتہ آدمی گاؤں میں جا کر کسی کو کچھ سکھانے کا خیال چھوڑ کر رات دن کام میں مگن ہوا رہے گا۔ اور آکاش میں جیسے تارے چندرماں کے چاروں طرف اکٹھے رہتے ہیں۔ ویسے ہی لوگ اس کے چاروں طرف اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہندوستان کے دیہاتی بڑے شکر گذار لوگ ہیں۔ گُن پرکھنے کی طاقت ان میں بھرپور ہے دیہاتی تعمیر کا کام چال چلن کی کمزوری کی حالت میں ممکن نہیں۔ اور گاؤں کے لوگوں کے لئے چال چلن کی کسوٹی ابتدائی صفات کی بنا پر رکھی جاتی ہے۔ اور یہی اصل کسوٹی ہے۔ مثلاً سست نہ ہونا، بے خوف ہونا، پریم و محبت وغیرہ۔ ظاہری صفات مثلاً گفتار دانائی وغیرہ گاؤں کے لوگوں کے لئے بہت کارگر نہیں ہوتے۔ گاؤں کے کام کرنے والے میں بھگتی کی لگن چاہیے۔ اور خیالات چاہئیں۔

لیکن اپنے لوگوں کے نیک خیالات ہیں ابھی ہم سمائے نہیں۔ یہ ہماری ناکامی کا بہت ہی بڑا باعث ہے۔ لوگوں کی صاف سمجھ ہم میں نہیں ہے۔ تو خیر۔ لیکن ان میں جو قیمتی خیالات ہیں۔ وہ تو ہم میں ہونے چاہیں۔ لیکن وہ ہیں نہیں بندگی سے ہم بھاگتے ہیں۔ پرماتما کا نام لینے سے ہمارے دل میں ایک خیالات کی لہر پیدا ہونی چاہیئے۔ لیکن وہ نہیں ہوتی۔ ایشور۔ دھرم۔ سنتوں کے متعلق پورا گیان نہ رکھنے والے گنواؤں میں جو بھگتی بھاؤ ہوتا ہے۔ وہ ان تینوں کے متعلق مکمل واقفیت نہ رکھنے والوں کے دلوں میں ان سے سو گنا زیادہ ہونا چاہیئے۔ لیکن ہمیں ایشور یا سادھو۔ سنتوں کے بارے میں بالکل ہی گیان نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے لوگوں کے دل سے ہمارا دل مل نہیں سکتا۔ چھوا چھوت جیسے خیالات لوگوں کے دلوں میں جو گھس گئے ہیں۔ انہیں نکال ڈالنے کی اس کی کوشش ہوگی یا اس کو کوشش کرنی چاہیئے۔ کہ جس کے دل میں پبلک کے دل جیسے نیک خیالات جوش مارتے ہوں۔ پبلک کے اچھے خیالات جس میں نہیں ہیں۔ وہ برے خیالات کیسے نکال سکے گا۔

لوگوں کے نیک خیالات میں شامل نہ ہو سکنا۔ جیسے ایک نقص ہے۔ ویسے ہی دوسرے لوگوں کی جسمانی واقفیت کی

خواہش رکھنے کا نقص ہمارے کام کے لئے نقصان دہ ہے۔ جس طرح بھی ہو لوگوں سے خوب جان پہچان بڑھانے کی خواہش سے اِدھر اُدھر کے کام میں فضول ہاتھ ڈالنے سے کام بگڑتا ہے۔ بہت جان پہچان کی خواہش سے ہمارے لئے لوگوں کے دل میں عزت کا خیال کم ہو جاتا ہے۔ لوگوں کی چھوٹی موٹی باتوں میں بے مطلب دھیان سے ہم اس کی سیوا نہیں کر سکتے۔ سیوک کو تعارف کی بجائے محبت آمیز سلوک کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لوگوں سے جان پہچان کچھ کم ہو۔ لیکن اس کے لئے لوگوں کے دل میں عزت زیادہ ہو۔ تو سیوک کے لئے وہ زیادہ اچھا ہے۔

لیکن لوگوں سے خوب جان پہچان ہونی چاہیئے۔ یہ بات اچھے اچھے سیوکوں کے منہ سے سنی جاتی ہے۔ اس کی جڑ میں اہنکار (غرور) چھپا ہُوا ہے۔ سیوک کو سیوا کے خیالات کی پرکھ ہونی چاہیئے۔ ہمارے جسم میں کوئی ایسا پارس پتھر نہیں چپکا کہ کسی کا کسی طرح بھی ہمارے ساتھ تعلق جڑا نہیں۔ کہ وہ سونا ہُوا نہیں۔ سیوا کے خیال سے لوگوں سے جتنی جان پہچان ہوتی ہو ضرور ہونی چاہیئے جان پہچان کے موقعے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالنے کی سیوک کو ضرورت نہیں ہے۔ سچے سیوک کے پاس سیوا خود بخود حاضر رہتی ہے۔ اس کے لئے موقع نہیں

ڈھونڈنا پڑتا۔ اس کے علاوہ ہم ہیں ایک اور دوش ہے۔ قربانی کا فخر۔ ہم تھوڑی بہت قربانی کر سکتے ہیں۔ مگر قربانی کا فخر قربانی کو زائل کر دیتا ہے۔ قربانی کر کے ہم کسی پر احسان نہیں کرتے اس کے علاوہ اگر شہری نکتہ نگاہ سے ہماری قربانی قربانی مانی بھی جائے۔ تو گاؤں کے لحاظ سے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ گاؤں میں تو بہت بڑی قربانی کی ضرورت ہے۔ گاؤں کے لوگ خود خواہ وہ مجبور ہی ہوں۔ قربانی کی زندگی ہی بسر کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہماری قربانی کسی گنتی میں نہیں۔ اور پھر اس پر فخر! اس سے تو سیوا بالکل ہو ہی نہیں سکتی۔ ان نقائص کے دور کرنے کی کوشش کرنے پر تو ہمارا گاؤں کا کام ناکامیاب نہ رہے گا۔

بھارت کی کپڑے کی ضرورت

(شری ونوبا بھاوے جی)

سارے ہندوستان کی کپڑے کی ضرورت کھدر کے ذریعے ہی پوری ہو سکے گی یا نہیں۔ اس کا ہم کبھی کبھی حساب کیا کرتے ہیں جب ہم حساب کرنے بیٹھتے ہیں۔ تب سوال یہ ہوتا ہے۔ کہ فی آدمی کتنے گز کپڑے کی ضرورت فرض کی جائے۔

دس بارہ [12] سال پیشتر ہندوستان میں فی آدمی چودہ گز کپڑا لگتا

تھا۔ اب ۱۷-۱۶ اگز لگتا ہے۔ ۴ اگز کپڑا بالکل ہی ناکافی ہے۔ اس کے مقابلہ میں ۱۶ - ۱۷ اگز کچھ تو ٹھیک ہے۔ لیکن کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ہندوستان کی اصلی ضرورت فی کس ۲۰ گز کپڑے کی مانی جانی چاہیئے۔ پنڈت جواہرلال جی کا تو آخری نمبر ۳۰ گز تک کا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کے بغیر ہندوستان کو پورا کپڑے کا آرام نہ ہوگا۔ اس سوال پر ایک دوسرے نکتہ نگاہ سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

کیا بارہ ۱۲ برس میں زیادہ کپڑے لگنے کا یہ مطلب ہے۔ کہ ہندوستان کو زیادہ کپڑے سے آرام ملنے لگا ہے؟

ملوں کی آج کی حالت دیکھنے سے اس سوال کے جواب میں ٹھیک طور سے ہاں نہیں کہہ سکتے۔ کپڑے کی کھپت بڑھانے کی غرض سے ملیں دن بدن زیادہ چھنترا کپڑا بنانے لگی ہیں۔ یہ کپڑا کچھ سستا اور وزن میں ہلکا ہوتا ہے۔ اس لیے لوگ اسے بڑے شوق سے خریدتے ہیں۔ وہ کم چلتا ہے۔ اس لیے کپڑا فی زنا زیادہ لگتا ہے۔ اور ہندوستان کی کپڑے کی مانگ پوری کرنے کا سہرہ ملوں کو خواہ مخواہ مل جاتا ہے۔ یہ چھنترا کپڑا چھ مہینوں سے زیادہ تو چلتا ہی نہیں۔ اور کبھی کبھی تو چار مہینے میں ہی پھٹ جاتا ہے۔ ایک شخص چار مہینے چلنے والے سال بھر میں تین دھوتی جوڑے پہنتا ہے۔ دوسرا چھ مہینے چلنے والے دو دھوتی جوڑے پہنتا

ہے۔ اور تیسرا بارہ[۱۲] ماہ چلنے والا ایک دھوتی جوڑا پہنتا ہے۔
اب فرض کیجئے کہ ہر ایک جوڑا دس گز کا ہے۔ تو ان تینوں نے
سال بھر میں ترتیب وار تیس[۳۰] گز۔ بیس[۲۰] گز اور دس گز کپڑا پھاڑا۔
لیکن تینوں نے سال بھر میں ایک سے زیادہ دھوتی نہیں پہنی
غرضیکہ جسے ہم کپڑے کا آرام کہتے ہیں۔ وہ تینوں کو برابر ہی ملا۔
ہاں اگر پرانی دھوتیاں جلدی جلدی پھاڑ کر نئی نئی پہننا بھی
کپڑے کے آرام کی ایک قسم مانی جائے۔ تب تو بات دوسری
ہے۔

لیکن کپڑے کے آرام کی یہ تباہ کن شکل ہندوستان کے
لئے مفید نہیں ہو سکتی۔ کپڑا مضبوط بنانے کے لئے نئے طریقے
کے مطابق جتنے تار کی گنگھی چاہئے اتنے تار سے کم تار میں چھترا
کپڑا بن کر کپڑے کی کھپت میں زیادتی پیدا کرنے میں ملک کو
سب طرح سے نقصان ہے۔ ہماری ضروریات زیادہ کپڑا استعمال
کرنے کی ہے۔ نہ کہ زیادہ کپڑا پھاڑنے کی۔ زیادہ کپڑا پھاڑنا ہمارے
لئے ٹھیک بھی نہ ہوگا۔ ہندوستان میں فی کس مشکل سے ایک
ایکڑ زمین ہے۔ اسے فضول کپاس کی کھیتی کے کام میں لانے
سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس لئے "کتنے گز کپڑے کی ضرورت
ہے"، یہ سوال فضول ہوگا۔ ہمیں تو "کتنی دیر ٹکنے والا کتنے گز
کپڑا چاہیئے"، اس سوال پر غور کرنا چاہئے۔

جنہوں نے تیس ۳۰ گز کی ضرورت فرض کی ہے۔ ان سے یہ سوال پوچھا جائے۔ تو وہ اکثر یہ جواب دیں گے۔ کہ چھ مہینے ٹکنے والا تیس ۳۰ گز کپڑا کافی ہوگا۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ تو ۹ مہینے ٹکنے والا بیس ۲۰ گز کپڑا وہ زیادہ پسند کریں گے۔ اور بارہ ۱۲ ماہ ٹکنے والا پندرہ ۱۵ گز کپڑا انہیں اگر میسر ہو تو وہ قدرتاً ناچنے لگیں گے۔ دیرپا کپڑے سے مطلب موٹا کپڑا نہیں۔ موٹا۔ باریک جو جیسا چاہے۔ اُسے ویسا ملنا چاہیئے وہ بھی مکمل بارہ ۱۲ مہینے چلنے والا بنایا جانا چاہیئے۔

کھدر کے کارکنان کو اس بات پر دھیان دینا چاہیئے۔ کہ اس کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ دکھانا اس مضمون میں مدعا نہیں ہے یہ تو خود تجربہ کرنے کا مضمون ہے۔ اس کے بارے میں الگ مضمون لکھنا پڑے گا۔ اس مضمون میں تو کپڑے کی ضرورت کا مطلب ظاہر کرنا مقصود تھا۔

کھدر میں سواراجیہ

(مہاتما گاندھی)

میں نے جب سے کھدر کی بات نکالی ہے۔ میں یہ کہتا آرہا ہوں کہ میں غریبوں کی خدمت کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ انہیں کے لئے سانس لے رہا ہوں۔ اور انہیں کے لئے مرجاؤں گا۔ اگر یہ کام کرتے ہوئے مروں گا۔ تو اپنی زندگی کامیاب سمجھوں گا۔ میں یہ

بھی کہتا چلا آ رہا ہوں۔ کہ کھدر ہی شدھ سودیشی ہے۔ میں نے یہ بھی ہمیشہ کہا ہے۔ کہ آزادی سوت کے دھاگے پر ہے۔ کھدر کا راز اگر آپ سمجھ لیں۔ تو اسی میں سوراجیہ نظر آئے گا۔

میں یہ بھی کہنا چاہتا ہوں۔ کہ کھدر اب پورانی ٹوٹی پھوٹی چیز نہیں رہی۔ بلکہ کھدر اب پھر جوان بن گیا ہے۔ اور خوبصورت بھی معلوم ہوتا ہے۔ خدا مجھے کہہ رہا ہے۔ کہ اس میں کوئی غلطی نہیں۔ اس میں سوراجیہ ہے۔ اس میں آزادی ہے۔

کھدر اور مسلمان

(مہاتما گاندھی)

معلوم ایسا ہوتا ہے۔ کہ مسلمانوں نے ابھی پورے طور پر کھدر کو استعمال کرنا شروع نہیں کیا۔ اس لئے نہیں کہ ان میں جذبات حب الوطنی نہیں ہیں۔ یا غلامی کے انسداد کے لئے ان کی رگ حمیت نہیں پھڑکتی۔ بلکہ اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہاتھ کے کتے اور ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے کو رائج کرنے سے ہماری مراد ہندوؤں کو فائدہ پہنچانا ہے۔ جو مسلم مفاد کے منافی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں۔ کہ مسلمانوں سے ہمارا سلسلہ امید ہی منقطع ہو گیا ہے۔ ہماری بہت سی امیدیں ان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ بلکہ ہماری تو امیدوں کا بیشتر سرمایہ ہی

سرمایہ ہی وہ ہیں۔ چنانچہ ہمیشہ ہی اُن کے ساتھ ترجیحی سلوک روا رکھا جاتا ہے۔ اس سے یہ بھی مراد نہیں۔ کہ ہندو آبادی کلیتہً "کھدر پوش" ہے۔ کیونکہ بدیشی کپڑے کی کھپت کے مقابلہ میں کھدر کی بکری ایک بے پایاں سمندر میں قطرے کی حیثیت کے سوا کچھ نہیں۔ اوسط آبادی کے متعلق اگر کچھ کہا جا سکتا ہے۔ تو یہ کہ ہندو اس سے بدگمان نہیں ہیں۔ لیکن اس کے بالکل برعکس مسلمان نہایت ہی جداگانہ بلکہ سخت رویہ اختیار کر رہے ہیں۔

کھدر کی تہ میں کوئی فرقہ وارانہ پالیسی ہرگز کام نہیں کر رہی اور اکھل بھارتیہ چرخہ سنگ عوام میں اس حقیقت کا انکشاف کر دینا چاہتا ہے۔ کہ کھدر کا اگر کوئی مطلب ہے۔ تو خدمت خلق خدا۔ بلا تفریق مذہب و ملت بالکل بے غرضانہ۔ عوام میں پیدا شدہ اس بدگمانی کو کہ کھدر اقتصادی نکتہ نگاہ سے مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کے لئے زیادہ سودمند ہے۔ دور کرنے اور اس سفید جھوٹ مٹانے کے لئے ذیل کی چند باتوں پر غور فرمایئے۔

(۱) ہندو اور مسلمان کسان کاتیوں میں بہ لحاظ آبادی مسلمان زیادہ تعداد میں کام کرتے ہیں۔

(۲) مسلمان کاتنیاں عموماً بہترین کاتتی ہیں۔ یعنی سب سے

زیادہ بھی کماتی ہیں۔

(۳) جولاہے۔ پنجارے اور رنگریز اکثر مسلمان ہی ہوتے ہیں۔

(۴) پنجارے اور جولاہے معقول معاوضہ پاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ہندو مسلم بیس۲۰ روپیہ ماہوار کے قریب کماتا ہے۔ نظم و تنظیم اور بار برداری وغیرہ پر تو بالکل معمولی خرچ آتا ہے۔ الغرض کھدر کی فروخت سے کمائے جانے والے نفع کا بیشتر حصہ کسی نہ کسی صورت میں عوام میں ہی تقسیم کر دیا جاتا ہے یعنی کھدر پہننا عوام کی سچی امداد کرنا ہے۔ مجھے امید ہے۔ کہ ہر ایک ہندو اور مسلمان اس حقیقت کو پا کر کھدر میں وشواش کرنے لگے گا۔

غیر تصدیق شدہ کھدر

(از قلم پنڈت جواہر لال نہرو)

مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ پنجاب میں کئی غیر تصدیق شدہ کھدر بھنڈاروں کے نے نہ صرف میرے نام کو ہی بری طرح استعمال کیا ہے۔ بلکہ دوسرے کئی ایک طریقوں سے میرے نام کو ناجائز طور پر استعمال کرتے ہیں۔ چونکہ میرا نام رجسٹرڈ نہیں ہے اس لئے میں دوسروں کو اس کا استعمال کرنے سے روک نہیں سکتا۔

لیکن مجھے غیر تصدیق شدہ بھنڈاروں یا ان کے مالکوں کے خلاف جو میرا فرضی حوالہ دے کر اپنے کام کو چلاتے ہیں سخت اعتراض ہے۔

جب گاندھی جی کے حکم کے مطابق چرخہ سنگ نے کاتنوں کی مزدوری میں اضافہ کیا۔ اور ان کے لئے ایک خاص مزدوری کا معیار قائم کر دیا۔ تو میں ان کے ساتھ پوری طرح سے متفق تھا۔ کیونکہ اگر کھدر کاتنوں کا پیٹ کاٹ کر اور ان سے زیادہ کام لے کر تیار کیا جائے۔ تو وہ اتنا فائدہ مند نہ ہوگا۔ اس لئے اگر کھدر نے ترقی کرنی ہے۔ جیسا کہ ہم چاہتے ہیں۔ کہ یہ ترقی کرے۔ تو کھدر مقرر شدہ مزدوریوں کی سکیم کے مطابق ہی تیار ہونا چاہئے جو بھنڈار اس سکیم کو منظور کرتے ہیں۔ وہی تصدیق شدہ ہیں یہ صاف ظاہر ہے۔ کہ جو اس کے مطابق عمل نہیں کرتے۔ وہ غیر تصدیق شدہ ہیں۔ کیوں کہ وہ جو کھادی تیار کرتے ہیں۔ وہ مزدوروں سے زیادہ کام لے کر اور کم اجرت دے کر ہی تیار کروائی جاتی ہے۔ اس لئے ایسا ہر ایک شخص جو اس بات کا خواہشمند ہے۔ کہ مزدوری کا خاص معیار ہی قائم ہو۔ اس کا یہ فرض اولین ہے۔ کہ وہ اسی کھدر کو ترجیح دے۔ جو پیٹ بھر دینے والی مزدوری کی سکیم کے مطابق تیار کیا گیا ہو۔ اس کا مطلب یہی ہے۔ کہ ہم صرف تصدیق شدہ کھدر بھنڈار سے ہی کھدر خریدیں۔

انفرادی طور پر اگر ہم کاتیوں۔ جولاہوں و دیگر مزدوروں کو دی جانے والی مزدوری کے متعلق واقفیت حاصل کرنا چاہیں تو یہ ناممکن ہے۔ لیکن جب ہم چرخہ سنگ واس کے تصدیق شدہ بھنڈاروں سے کھدر خریدتے ہیں۔ تو ہمیں پورا دشواش ہوجاتا ہے۔ اور ہمیں خوشی ہونی چاہئے۔ کہ ہم چرخہ سنگ کی کاتیوں۔ جولاہوں و دیگر مزدوروں کو نئی سکیم کے مطابق مقرر شدہ مزدوری دینے میں امداد کر رہے ہیں۔

اس لئے میں امید کرتا ہوں۔ کہ سب کانگرسی اور دوسرے لوگ جو یہ جانتے ہیں۔ کہ کھدر ترقی کرے۔ تصدیق شدہ کھدر کو ہی استعمال کرنے پر زور دیں گے۔

ہندوستان ایک راشٹر ہے

(سر سیّد احمد خاں)

قدیم زمانہ سے "راشٹر" لفظ ایک ملک کے باشندوں کے لئے استعمال ہوتا آیا ہے۔ خواہ پھران باشندوں میں ہر ایک کی اپنی کچھ خصوصیتوں کے باعث فرق بے شک ہو۔ ہندو اور مسلمان بھائیو۔ کیا آپ ہندوستان کے علاوہ اور کسی ملک میں رہتے ہیں؟ کیا آپ ایک ہی ملک میں نہیں رہتے؟ کیا آپ ایک ہی زمین میں دفنائے یا جلائے نہیں جاتے؟ کیا آپ ایک ہی زمین پر نہیں

چلتے پھرتے اور زندگی بسر کرتے ہیں، یاد رہے کہ "ہندو" اور "مسلمان" لفظ صرف دھرم کا فرق بتانے کے لئے ہے۔ ورنہ سبھی اشخاص خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان بلکہ اس ملک میں رہنے والے عیسائی بھی اس بارے میں ایک ہی ملک کے ہیں۔

تب یہ مختلف جماعتیں ایک ہی راشٹر کے نام سے پکاری جاسکتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کو اس ملک کی بھلائی کے لئے ایک ہونا چاہئے۔ جو کہ سب کا ہے۔

بھکشا (بھیک مانگنا)

(از شری ونوبا بھاوے جی)

انسان کی زندگی تین طرح کی ہوتی ہے:-

(۱) بھکشا (۲) پیشہ (۳) چوری

(۱) بھکشا (بھیک مانگنا) یعنی سماج (سوسائٹی) کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر کے سماج سے صرف زندگی قائم رکھنے کے لئے کم سے کم لینا۔ اور وہ بھی مجبوراً۔

(۲) پیشہ:- یعنی سماج کی خاص خدمت کر کے اس کا مناسب بدلہ یا معاوضہ مانگ لینا۔

(۳) چوری:- یعنی لیٹرے۔ خونی اور ان جیسے انتظام کرنے والے پولیس۔ سپاہی۔ حاکم وغیرہ سرکاری ملازم انتظام کے

بیرونی مددگار وکیل۔ ڈئیڈ۔ استاد۔ دھرم اپدیشک اور بیوپاری
یہ سب تیسرے درجہ میں آتے ہیں۔

ماتری بھومی پر مشقت کرنے والے کسان اور زندگی کی ابتدائی ضروریات پوری کرنے والے مزدور یہ دوسرے درجہ میں شمار ہونے کے خواہش مند ہیں۔ لیکن ہو نہیں سکتے۔ وجہ یہ ہے کہ ٹھیک قسم کی محنت و مشقت حاصل کرنے کی خواہش ہوتے ہوئے بھی۔ تیسرے درجہ کی کرتوت کے باعث آج ان میں سے بہتوں کو ٹھیک قسم کی مشقت حاصل نہیں ہوتی۔ اور وہ جبراً پہلے درجہ میں دھکیلے جا رہے ہیں۔ لیکن جو جبراً پہلے درجہ میں پہنچائے جاتے ہیں۔ وہ بلا شک تیسرے درجہ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

پہلے درجہ میں داخل ہو سکنے والے بہت ہی تھوڑے سچی لگن کے نیک آدمی ہیں۔ بہت ہی تھوڑے۔ لیکن ہیں۔ اور انہیں کی طاقت پر دنیا قائم ہے۔ وہ تھوڑے ہیں لیکن ان کی طاقت تعجب انگیز ہے۔

"بھگتا ختم ہو رہی ہے۔ اس کو پھر سے زندہ کرنا چاہیئے"۔ جب سمرتھ گورو رامداس یہ کہتے ہیں۔ تو ان کا مطلب اسی پہلے گروہ کو بڑھانا ہے۔ اسی کو گیتا میں "یگیہ شیشٹ" امرت کھانا کہا ہے۔ اور گیتا اعتقاد دلاتی ہے۔ کہ یہ امرت کھانے والا آدمی نجات پا جاتا ہے۔

آج ہندوستان میں ۵۲ لاکھ آدمی بھیک مانگنے والے ہیں
سمرتھ کے وقت میں بھی بہت بھیک منگے تھے۔ پھر بھی بھکشا کو
ترقی دینے کی ضرورت سمرتھ کو کیوں محسوس ہوئی۔ اس کا
جواب بھکشا کی تشریح میں ہے۔ باون لاکھ کی بھکشا کا جو مطلب
ہے۔ وہ چوری کی ہی ایک قسم ہے۔

بھکشا کا مطلب ہے۔ زیادہ سے زیادہ محنت اور کم سے
کم لینا۔ اور اتنا بھی اس لئے کہ نہ لینے پر گذر نہیں ہوتا۔ لہذا
اتنا تو لینا ہی پڑتا ہے۔ تاکہ جسم و جان کو قائم رکھا جا سکے لیکن
اپنا حق سمجھ کر نہیں۔ بلکہ اس خیال سے کہ سماج کا مجھ پر احسان
ہے۔ اس خیال سے بھکشا میں دوسروں پر بھروسہ نہیں۔ بلکہ
ایشور پر بھروسہ ہے۔ سماج کے اچھے خیالات میں اعتقاد ہے۔
اور فرض کی ادائیگی ہے۔

لوک سیوک کا اپنے جسم کی حفاظت کرنا بھی ساماجک کام
ہے۔ اور کھدر کے پرچار کے ساماجک کام کے لئے اگر کسی کو کوئی
پونجی دی جائے۔ تو اس پونجی کو وہ ٹھیک طرح سے حساب رکھ کر
اسی کام میں لگاتا ہے۔ اسی طرح اگر میں لوک سیوک ہوں۔ تو
میرا زندگی قائم رکھنے کا کام بھی کھدر کے کام جیسا ہی ساماجک کام
ہے۔ اور اس کے لئے مجھے اتنا خرچ ضرورت کے مطابق سماج دیتا
ہے۔ اس رقم کا استعمال مجھے اسی کام میں کرنا چاہئے۔ ٹھیک طور

سے کرنا چاہیئے۔ اس کا حساب رکھنا چاہیئے۔ اور وہ حساب لوگوں کی پڑتال کے لیئے پیش کرنا چاہیئے۔ یعنی سب طرح سے ایک پنچ جیسے انتظام کرتا ہے۔ ویسے ہی سچے خیال سے مجھے اپنے جسم کا انتظام کرنا واجب ہے۔ یہ بھکشا کا طریقہ ہے۔

کچھ سیوکوں کو کہتے سنا جاتا ہے۔ اپنے پیسے کا ہم خواہ کیسے ہی استعمال کریں۔ سا ماجک پیسے کا ہم ٹھیک حساب رکھیں گے۔ لوگوں کو دکھائیں گے۔ ان کی نکتہ چینی سنیں گے انہیں تسلی دلائیں گے۔ ورنہ معافی مانگیں گے۔ لیکن اپنے پیسے کا حساب رکھنے پر ہم مجبور نہیں ہیں۔ اور دوسروں کو دکھانے کی تو بات ہی کیا ہے؟ اگر سچائی سے کوئی سیوا کرنے والا آدمی ایسا کہے۔ تو اس کی سیوا "پیشہ" بن جاتی ہے۔ پیشہ ایماندارانہ سہی پر ہے پیشہ۔ وہ بھکشا نہیں بن سکتا۔

بھکشا کہتی ہے۔ "تیرا پیسہ کیسا؟" جیسے کھدر کے کام کے لیئے کھدر کا ماہر مان کر تمہیں پیسہ سونپا گیا۔ اسی طرح تمہارے جسم کے کام کے لیئے تمہیں اس کا ماہر سمجھ کر پیسہ دیا گیا۔ کھدر کے لیئے دیا ہوا پیسہ جب تمہارا نہیں ہے۔ جسم کے لیئے دیا ہوا پیسہ تمہارا کیسے ہوا؟ دونوں کام سماجک ہی ہیں۔

ایک کھدر پر چارک سے پوچھا گیا۔ تمہیں کتنے کی ضرورت ہے؟

"تیس روپے مہینے کی۔"

"اکیلے ہو تم۔ تو پھر اتنے کی ضرورت کیوں"؟

"دو تین طالب علموں کو میں مدد دیتا ہوں۔"

ہم یہ مان لیتے ہیں۔ کہ غریب طلبا کو اس طرح مدد دینا ٹھیک ہی ہے۔ مگر خیال کرو۔ کہ کھدر کے کام کے لئے تمہیں جو پونجی دی گئی ہو۔ اس میں سے بھی کیا تم تعلیم کے کام میں خرچ کروگے؟"

"یہ نہیں ہو سکتا۔"

"تب تمہارے جسم کو بر قرار رکھنے کا جو ایک ساماجک کام ہے۔ اس کے لئے تمہیں دی گئی رقم میں سے غریب طلبا کو مدد دینے کا جو دوسرا ساماجک کام ہے۔ اس میں خرچ کرنا کیسے مناسب ہوگا؟"

بھکشا والے آدمی کو دان کا حق نہیں ہے۔ دان ہو یا بھوگ "میں" ہی دونوں میں فاعل ہوں۔ اور بھکشا میں "میں" کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اس سے دونوں کا خاتمہ ہو گیا۔ نہ بھوگ میں پھنسو نہ تیاگ میں پڑو۔ یہ بھکشا کا اصول ہے۔ بھکشا کے معنے ہیں گھر کو وسیع بنانا۔ بڑی ذمہ داری سر پہ لینا۔ بھکشا غیر ذمہ دار نہیں ہے۔ بھکشا مانگنے کے معنے ہیں۔ مانگنا چھوڑ دینا۔ بائیبل میں لکھا ہے۔ "مانگو تو مل جائے گا۔" اس کا مطلب ہے۔ بھگوان سے

مانگو تو ملے گا۔ لیکن سماج سے "مانگو مرت" ملے گا۔ بھکشا مانگنا یہ لفظ بے جوڑ ہے۔ وجہ بھکشا کے معنے ہیں "مانگنا" بھکشا مانگنا یہ لفظ بھکشا دوہراتا ہے۔ کیونکہ بھکشا ہی خود "مانگنا" ہے۔ بھکشا مانگنی نہیں پڑتی۔ فرض کی گتھلی میں ٹکے دھرے ہوئے ہیں۔

اب بھی ہوشیار ہو جائیں

(شری کشور لال جی مشروالا)

"۱۹۱۸ء میں ہمارے ملک کی فتح ہونے کے بعد، تیاگ کی نسبت عیش و آرام کے خیالاتوں کا ہمارے لوگوں میں زیادہ اثر ہونے لگا۔ لوگوں نے تیاگ کم کیا۔ لیکن خواہشات بڑھائیں محنت سے جی چرانے کا خیال رہا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ہمارے ملک پر بدبختی آگئی ہے"۔

جرمنی کی اطاعت قبول کرتے وقت رعایا کو صفائی دیتے ہوئے فرانس کے وزیر اعظم مارشل پیٹیان نے جو تقریر کی تھی۔ اس میں سے مندرجہ بالا الفاظ دیے گئے ہیں۔ مجھے ان الفاظ میں کوئی غلطی معلوم نہیں دیتی۔ میں مانتا ہوں۔ کہ جو بات فرانس کے بارے میں پیٹیان نے بتائی ہے۔ وہی حالت دیگر ممالک کی بھی ہو گی۔ پچھلے سال جب چین میں جاپان کے ہاتھیوں انگریزوں کے ذریعے اپنی طرف قابل شرم بے عزتی برداشت کر لینے کی

خبریں اخباروں میں، میں نے پڑھیں۔ تبھی سے میں یہ محسوس کر رہا ہوں۔ کہ جس بیماری سے ہندوستان میں راجپوتوں کی تنزلی ہوئی اور جس کی وجہ سے افغانوں کی۔ ان کے بعد مغلوں کی۔ اور ان کے بعد مرہٹوں اور سکھوں کی تنزلی ہوئی۔ وہی بیماری انگلینڈ کو لگ چکی ہے۔ اب رعایا جنگ کی چوٹ کو برداشت نہ کر سکے گی۔ اس کے پہلے آثار چیکوسلوویکیہ کے متعلق دکھائی دیتے ہیں۔ مسٹر چیمبرلین نے یوں توں کر کے لڑائی کو روک دیا۔ اس کا مجھے تعجب نہیں ہوا۔

میں کچھ عرصہ سے اس کے متعلق اپنے ملک کے خیالاتوں کا دھیان کھینچنے کی کوشش کرتا آیا ہوں۔ اتفاق سے یہ کوشش علم ادب۔ موسیقی اور ہنر کے اصول سمجھانے سے شروع ہوئی۔ میرے خیالات کے متعلق کچھ غلط فہمی بھی ہوئی۔ اور گجرات میں مجھے علم موسیقی کے خلاف ہونے کی بدنامی بھی ملی۔ پھر بھی اگر ملک کی زندگی تباہ کرنے والے اس خوفناک بیماری سے خبردار ہو جائیں۔ اور اس سے بچنے کی ضرورت سمجھ جائیں۔ تو اس بدنامی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔

عیش و آرام اور بڑی خواہشات نے کسی ملک کو نیچے نہ گرایا ہو۔ ایسا میں نے کہیں بھی دنیا کی تاریخ میں نہیں پڑھا ہے۔ محنتی اور زندگی کی مشکلات کو برداشت کرنے والی قوموں کے

ہاتھ حکومتوں کا قائم ہونا۔ اور ان کے کاہل، عیش پرست اور نازک جانشینوں کے ہاتھ ان کی بربادی سبھی ممالک کی تاریخ کا اتنا ہی نچوڑ ہے۔

عروج پر پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ اور وہ راستہ سادگی کا ہے۔ شوق کا نہیں۔ آٹھ نو یا اس سے بھی زیادہ گھنٹوں تک محنت کرنے کی خواہش و طاقت رکھنے والوں کا ہے۔ دو گھنٹے کام کر کے بارہ گھنٹے آرام کرنے کی خواہش کرنے والوں کا نہیں۔ سال میں آٹھ دس بار سادہ ہنسی کھیل پر صبر کرنے والوں کا ہے۔ ہفتہ میں تین چار بار سینما کا لطف۔ ہر روز ہوٹل میں صحبت۔ اور ریڈیو کے گانوں سے خوش ہونے والوں کا نہیں۔ سامنے آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی اور پیچھے دھوواں اور گرد کا پرشاد دینے والی موٹر جیسی یہ تہذیب ہمارے کام کی نہیں ہے راستے میں جھاڑو لگاتے جانے والی چالیس پچاس نمبر کے سوت کی دھوتی اور دونوں پاؤں سما جانے والے فضول کے چوڑے اور زمین کی گندگی کو اٹھانے والے پاجامے اور جسمانی سجاوٹ ملک کے سوار ا۔ کو ٹکنے نہ دیں گے۔ نہ عدم تشدد کے ذریعے اور نہ تشدد کے ذریعے۔

انقلاب اور دنیا کی نئی بناوٹ، کی ہم رٹ لگا رہے تھے۔ وہ اب ہمارے نزدیک آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ بہت سے

لوگوں نے سمجھا ہوگا۔ کہ جس طرح آج سورج ڈوبتا ہے۔ اور کل سویرے سورج نکل آتا ہے۔ اسی طرح یہ انقلاب بھی آتا ہوگا۔ لیکن دنیا کی سرزمین پر زلزلہ کے ذریعہ ہی ایسے پھیر پھار ہوا کرتے ہیں۔ اس چوٹ کا خوف ہمیں گھبرا رہا ہے۔ عدم تشدد اور تشدد کی فوج کھڑی کرنے کا خیال اسی کا نتیجہ ہے۔ لیکن فوج تشدد یا عدم تشدد کی ہو۔ اتنا ضرور سمجھ لیا جائے۔ کہ مضبوط بدن کے محنتی اور فوراً تیار ہو سکنے والے نوجوانوں کا ہی اس میں استعمال ہو سکے گا۔ اور دنیا کی جو نئی بناوٹ ہوگی۔ اس کا انتظام خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ انہیں لوگوں کا اس میں ہاتھ رہے گا۔ وہ راجیہ آرام دہ ہو خواہ تکلیف دہ۔ جنہوں نے سادگی اور محنت کو زندگی میں جگہ دی ہوگی انہیں کے ہاتھوں میں حکومت کی سچی باگ ڈور چلی جائے گی۔ آرام طلب لوگ منہ مانگے دام دے کر بھی شاید ہی اپنا گذارہ کر سکیں گے۔ ہم اب بھی ہوشیار ہو جائیں!

پانی صاف رکھنے کی ترکیب

مسٹر رچرڈ بی۔ گریگ کے خط کا اقتباس:۔

ایک خط میں شری جے سی کمار اپا کو کچھ ایسی باتوں کے بارے میں لکھ رہا ہوں۔ جن پر عرصے سے ان کے ساتھ بات چیت کرنے

کی میری خواہش رہی ہے۔ اس میں چند مشورے ہیں۔ جن کے بارے میں اکھل بھارتیہ گرام اُدیوگ سنگھ تجربے کر سکتا ہے۔ ان میں سے ایک صلاح تو یہ ہے۔ کہ بیتھلین کے جراثیم کو مارنے والی گولیوں سے بھری ہوئی سنہری کی جالی کی چھوٹی چھوٹی تھیلیاں پانی کی سطح گز بھر یا اس سے زیادہ اوپر رہیں۔ ان گولیوں کی مہک کو مچھر بہت ناپسند کرتے ہیں اور چونکہ یہ بغیر مہک کی ہوا سے کچھ بھاری ہوتا ہے۔ اس لئے پانی کی سطح پر کمبل کی طرح پھیلا رہے گا۔ اور پانی کو خراب کئے یا مچھروں کو مارے بنا ہی وہ مچھروں کو پانی میں انڈے دینے سے دور رکھے گا۔ مہک پانی میں جذب نہیں ہوتی۔ اس طرح جراثیم کی پیدائش کو ایک سستے اور آسان طریق سے روکا جا سکتا ہے۔ میرے باغ میں ایک چھوٹا۔ کھلا۔ فولاد کا نیا کنڈ ہے۔ اس میں تجربہ کرنے پر یہ تجویز کار آمد ثابت ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے۔ کہ ان گولیوں کو احمد آباد کے بازار میں میں نے فروخت ہوتے دیکھا تھا۔ اس لئے میں مان لیتا ہوں۔ کہ وہ آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہ آسانی سے نہ بھی ملیں۔ تو بھی کچھ تیز مہک والی بوٹیاں ایسی مل سکتی ہیں جو مچھروں کو بھگانے کے لئے ویسی ہی کام آ سکتی ہیں۔ گولیوں کی جگہ ان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جراثیم مارنے والی گولیاں

کچھ عرصہ کے بعد ہوا میں اڑ جاتی ہیں۔ اس لئے ان پر دھیان رکھنا اور وقت وقت پر ان میں گولیاں ڈالتے رہنا پڑیگا۔

اس اصول پر دوسری طرح بھی عمل کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ گاؤں کے تالابوں یا ندیوں کے کناروں پر کچھ زیادہ مہک والے پودے لگا دیئے جائیں۔ یہ پودے پانی کے بالکل قریب ہونے چاہئیں۔ زیادہ مچھر اپنے انڈے کیچڑ والے پانی پر دیتے ہیں۔ اس لئے جراثیم چھوٹی مچھلیوں کی خوراک بننے سے بچ جاتے ہیں۔ اگر ٹھیک بوٹیاں چنی جائیں۔ وہ جن کی مہک مچھروں کو دور بھگانے والی ہوتی ہے۔ اور ان مقامات پر بو کر اگائی جائیں۔ تو ممکن ہے۔ اس ترکیب سے ملیریا رفع کیا جا سکتا ہے۔ میں ان دونوں طریقوں کو تجربہ کے لئے موزوں سمجھتا ہوں۔ "منٹ" کی قسم کی بوٹیاں مچھروں کو روکنے کے لئے مشہور ہیں۔

نوٹ:۔ ریحان (نیاز بو) تلسی وغیرہ قسم کی جڑی بوٹیاں عموماً ملیریا کی روک تھام کے لئے کئی ایک جگہ استعمال کی جاتی ہیں۔ جن کھیتوں کو کئی ایک قسم کے کیڑے لگ جاتے ہیں اس کے گرد ان کی باڑ لگانے سے کیڑے پیدا نہیں ہوتے۔ اس قسم کے تجربے کئی ایک جگہ پر کئے گئے ہیں۔ ملیریا کے جراثیم کو مارنے کے لئے تلسی ایک مشہور دوائی خیال کی جاتی ہے۔

(مصنف)

بمبئی میں سات روز

از قلم شری یت مہادیو دیسائی

ایڈیٹر "ہری جن" و پرائیویٹ سیکرٹری مہاتما گاندھی

روسی انقلاب کی "تاریخ" لکھنے والے ایک مصنف نے سوویٹ روس کے قیام سے پہلے کے دس ایام کے واقعات کو ڈائری کی شکل میں قلمبند کیا تھا۔ اس نے اس کا نام یہ تجویز کیا "وہ دس دن جنہوں نے دنیا کی بنیادوں کو ہلا دیا"۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ بمبئی کے ان سات دنوں یعنی ماہ ستمبر کی بارہ ۱۲ تا اٹھارہ ۱۸ تاریخ۔ کو بھی دنیا کی تاریخ میں "بمبئی کے وہ سات دن جنہوں نے دنیا کی بنیادوں کو ہلا دیا" کے نام سے تعبیر کیا جا سکے، شاید یہ نام بمقابلہ روس کے دس دن کے زیادہ موزونیت اختیار کر سکے، روس کے یہ دن انقلاب کی گوناں گوں خوفناکیوں سے پُر تھے۔ لیکن بمبئی کے سات دن ان سے بالکل مختلف قسم کے تھے۔ وہ اس قدر پُر امن تھے۔ جتنا ہونا ممکن تھا اور وہ نہ صرف ہندوستان کی پُر امن آزادی کی طرف رفتار میں ہی تمیزی شان پیدا کرنے والے ہیں۔ بلکہ ساری دنیا کی امن کی طرف رفتار میں بھی۔

سارے کا سارا نقشہ ہی امن کا تھا۔ جنگ کا نہیں۔ کیونکہ اگرچہ یہ ان لوگوں کا مجمع تھا۔ جو اپنے قیام ہستی کے حق کو منوانے کے لئے

جنگ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ تاہم یہ وہ لوگ تھے۔ جو ایک مکھی کو بھی گزند نہ پہنچانا چاہتے تھے۔ لہذا سرکار کی حفاظت خود اختیاری کے طور پر۔ فوج کا تو کیا کہنا۔ پولیس کے بھی کوئی خاص انتظامات کرنے کی ضرورت نہ پڑی۔ جمع ہونے والے لوگ ایک پُرامن انجمن کے مہمان تھے۔ اس انجمن کا نام ایسٹ انڈیا کاٹن ایسوسی ایشن ہے یہ انجمن عام طور پر سیاسیات ملک سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی۔ لیکن تاریخ ہند میں اس نازک دور پر انہوں نے اپنے متعلق سیاسیات میں دلچسپی لینے کی غلط فہمی پھیلنے کی بھی کوئی پرواہ نہ کی۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے تھے۔ کہ معاملہ زیر بحث ان پر بھی اسی طرح اثرانداز ہوتا تھا۔ جیسا باقی ہندوستان پر۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ۔

ورکنگ کمیٹی کے لئے بھی کانگرس کی تاریخ میں یہ ایک نازک ترین موقع تھا۔ جون کی تاریخ اٹھارہ سے لیکر جبکہ واردھا کا بیان شائع ہوا تھا۔ آج تک کا زمانہ اس کے لئے اور گاندھی جی کے لئے بھی سخت محنت کے دن تھے۔ گاندھی جی کے لئے تو وہ پرارتھنا کے بھی دن تھے۔ میں یہاں ان دنوں کے واقعات کی روزانہ رپورٹ تو یہاں نہیں دینا چاہتا۔ مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی آل انڈیا کانگرس کمیٹی والی تقریر میں ایک دو فقروں میں ہی اس کا سارا نچوڑ دیدیا تھا۔ کمیٹی کے چند ممبران کی بیہودہ اور غیرذمہ دارانہ تقریروں سے پنڈت جی کو بہت رنج پہنچا تھا۔ اور وہ ان کے ساتھ بحث کر رہے تھے

تاکہ وہ اپنے طریقوں کی غلطی کو محسوس کر سکیں۔ پنڈت جی نے کہا کیا آپ جانتے ہیں۔ مہاتما گاندھی نے کیا کیا ہے؟" انہوں نے ریزولیوشن کے متعلق تمام تر ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی ہے۔ لیکن کیا آپ کو معلوم ہے یہ ریزولیوشن کیسے بنا؟ روحانی طور پر وہ کس قدر بلند ہیں۔ یہ میں اندازہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ سیاسی طور پر وہ ایک لاثانی شخصیت ہیں جہاں تک اصولوں کا سوال ہے۔ اس کی لوہے جیسی مضبوط روح کسی قسم کے سمجھوتے کی اپیل کے سامنے جھکنے کو تیار نہیں ہوتی۔ لیکن وہ گھنٹوں تک ہمیں شانتی سے سمجھاتے رہے۔ تاکہ ہر ایک قسم کا نظریہ و دلیل جو ہم پیش کر سکتے تھے۔ ان کے لوح دل پر اثر انداز ہو سکے۔ انہوں نے ایک مسودہ تیار کیا پھر دوسرا اور پھر تیسرا حتے کہ اس کوشش میں لگے رہے۔ کہ ان سب خیالات کو جو ہم لوگوں نے ظاہر کئے ہیں محفوظ رکھا جائے۔ اور تب تک دم نہ لیا۔ جب تک کہ ایسا ریزولیوشن تیار نہ کر لیا۔ جو کہ ہم سب لوگوں کے دلوں کا مجموعی عکس نہ ہو۔

دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ گاندھی جی لمحہ بہ لمحہ مہان سے مہان ہوتے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے اس پہلے مسودہ کو تیار کرنے میں پورے دو گھنٹے خرچ کئے تھے۔ جو کہ آخر کار پاس شدہ ریزولیوشن کی بنیاد قرار دیا گیا تھا۔ انہیں باوجود اس قدر محنت کے جو انہوں نے اس مسودہ پر خرچ کی تھی۔ یہ معلوم نہ تھا کہ اس

میں باقی ممبروں کے خیالات کا بھی عکس موجود ہے۔ جب انہوں نے ہاؤس میں ہندی میں تقریر شروع کی اگرچہ وہ مضبوط اور جچے تلے لب و لہجہ میں تھی۔ مگر اس میں کچھ کچھ رکاوٹ اور تامل بھی نمودار تھا۔ انہوں نے کہا۔ "جو ذمہ داری میں آج لینے لگا ہوں۔ شاید وہ ان سب سے گراں ہے جو کہ آج تک کبھی بھی میں نے اپنی زندگی میں لی ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ میں آپ کی تسلی کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا یا اپنی بھی تسلی کر سکوں گا یا نہیں نہ ہی مجھے نتیجہ کا ذرا بھر بھی وہم و گمان ہے۔ میں تو فقط ذریعہ سے واسطہ رکھتا ہوں۔ جب مجھے ذریعہ کی پاکیزگی کا یقین ہو جاتا ہے تو میرا ایمان آگے بڑھنے کے لئے میری رہنمائی کے لئے کافی ہوتا ہے اس ایمان کے آگے سب طرح کا لرزہ و خوف کافور ہو جاتا ہے اور جب ہم ایک دفعہ قدم آگے رکھدیں گے پھر پیچھے ہٹنے کا کیا کام"۔ انگریزی تقریر میں مضبوطی اور بھی بڑھ گئی۔ مہاتما جی کی اندر کی آتما بول اٹھی "ہم نے کافی لمبے عرصہ تک انتظار کی ہے۔ اب ایک ایسا وقت آن پہنچا ہے۔ جب کہ نیکی بدی میں تبدیل ہو سکتی ہے"۔ لیکن ابھی تک مستقبل کے متعلق میری آنکھوں کے سامنے گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا رہا ہے کیا آپ اپنا جہاز ایسے کپتان کے حوالے کرنے کو تیار ہیں، جو خود اندھیرے میں ٹٹول رہا ہے، اگر آپ تیار ہیں۔ تو بہت بہتر ورنہ اس کی کپتانی کو ترک کردو"۔ کئی دن تک مہاتما جی روشنی کے لئے انتظار کرتے رہے۔ مگر انہیں اندھیرا ہی اندھیرا نظر پڑا۔ ایک دھندلی سی شعاع ان کے اعتقاد

میں نمودار ہوئی۔ جس کے بل بوتے پر انہوں نے ورکنگ کمیٹی کو مشورہ جات دیئے۔ لیکن دھند کا سیاہ پردہ ابھی تک حاوی تھا دوسرے دن یہ ہٹا اور مہاتما جی نے پورے یقین کے ساتھ اعلان کیا "جو چیز میں نے آپ کے سامنے رکھی ہے۔ وہ معمولی نہیں ہے۔ میرا بھی پہلے یہ خیال تھا۔ کہ یہ معمولی ہے لیکن حقیقتاً یہ معمولی نہیں یہ میرے دماغ کی اپج نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو میرے دل سے ان کہنوں سے نکلی ہے۔ جہاں انتر آتما نواس کرتی ہے۔ یہ اس پرماتما کا ہی عطیہ ہے۔ یہ لا انتہا انتظار کشی کے بعد ظہور میں آیا ہے"۔

سچ مچ ایک دفعہ پھر اس بھجنیک کے الفاظ سچے ثابت ہو گئے۔ جس نے کہا تھا۔" سچے اور راست گو انسان کے لئے روشنی اور خوشی اس کے اپنے دل کے اندر بستی ہے"۔

خوبی کس وقت برائی بن جاتی ہے

میں نے مختصراً ان ابتدائی حالات کا خاکہ پیش کیا ہے۔ جن کے درمیان یہ واقعہ ہوا۔ اب میں مہاتما جی کی تین تقاریر میں سے اہم اقتباسات پیش کروں گا۔ اخبارات میں وہ کافی لمبے طور پر چھپ چکے ہیں۔ مگر چونکہ ان کی کانٹ چھانٹ نہیں کی گئی اور نہ ہی معتبر ذریعہ سے اشاعت پذیر ہوئے ہیں۔ لہذا اس میں غلطی کے شبہ بننے کی گنجائش رہتی ہے۔ میں تو صرف ایسا اختصار دینا چاہتا ہوں۔

جس میں خاص اہم مقامات پر زور دیا گیا ہو۔

مہاتما جی کے ایک عزیز دوست نے فیصلہ کرنے کے وقت سے عین پیشتر ایک تار بھیجا تھا۔ جس میں مہاتما جی کو یاد دلایا گیا تھا۔ کہ آغاز جنگ کے موقعہ پر جس ہمدردی اور غیر مشروط تعاون کا وطیرہ انہوں نے اختیار کیا تھا۔ اُسے نہ بھولیں۔ وہ اسے بالکل نہیں بھولتے تھے۔ لیکن جب تک وہ دوسرے کانگرسیوں کے دماغ اور دل کو اپنا ہم خیال نہ بنا لیتے۔ وہ وطیرہ نو نکما تھا۔ جیسا کہ انہوں نے کہا۔ "جو کچھ میں نے کہا تھا۔ اگر اس کی گونج دوسرے ساتھیوں کے دلوں میں پیدا نہ ہوئی۔ تو وہ وائسرائے کے لئے۔ برطانیہ کی عظیم الشان قوم کے لئے۔ اور ہندوستان کے لئے کسی مصرف کا نہ تھا۔" مگر واردھا میں جنگ کے متعلق ریزولیوشن پاس کرنے کے بعد انہوں نے پورا ایک سال گزار دیا تھا۔ مہاتما جی کو اس انتظار کشی کا کوئی افسوس نہیں کیوں کہ اس انتظار سے فائدہ ہی حاصل ہوا ہے۔ بہر حال مہاتما جی جس وقت اپنے خیال کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اس انتظار کی بدولت ہی حاصل ہوئی تھی۔ ورنہ کیا وجہ تھی۔ کہ وہی آدمی جو دن رات تنگ کرنے کی رٹ لگاتا رہا ہو آج اس قسم کا ریزولیوشن ان کے سامنے پیش کرتا ہ، مہاتما جی نے کہا۔ "انسان کی زندگی میں ایسے بھی اوقات آتے ہیں۔ جب خوبی برائی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔" مزید براں "میں اس وقت صرف کانگرس کے نام پر نہیں بول رہا۔ بلکہ ان

سب کے نام پر جو قومی آزادی کے حامی ہیں۔ یعنی مسلم، پارسی، ہندو
عیسائی اور وہ بھی جو اگرچہ کانگرس کے تو خلاف ہیں۔ مگر ہندوستان
کی متفقہ خواہش "کامل آزادی" کے خواستگار ہیں۔ میں ان سب کے
ساتھ غداری کرنے کا مرتکب ہوں گا۔ اگر میں اس موقعہ پر بھی یہی رٹ
لگاؤں کہ " برطانیہ کو تنگ مت کرو " اس مرحلہ پر میرا اس بات کو دہرانا
میری نیکی کی حفاظت اور مکتی کے لئے اتنا ہی مفید ثابت ہوگا۔ جتنا کہ
ایک طوطے کا رام نام سمرن جیسے وہ بلا سوچے سمجھے بناوٹی طور پر اپنی
زبان سے بول دیتا ہے۔ اور جو اسے خدا کا قرب حاصل کرنے میں
کوئی امداد نہیں پہنچاتا۔ لہٰذا اگر اس قومی تاریخ کے نازک ترین لحظہ پر میں
خاموش بیٹھا رہنے کی کوشش بھی کرتا۔ تو میں اپنے آپ سے غداری
کا مرتکب ہوتا۔ خودکشی کے مترادف ہوتا۔ ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ
سکتے ہیں۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اور جے پرکاش
نارائن جیسے آدمیوں کو جن سے بڑھ کر بہادر اور راست رو آدمی
ملنے مشکل ہیں۔ جیلوں میں ٹھونسا جا رہا ہو۔ اس لئے نہیں۔ کہ
انہوں نے تشدد کا پرچار کیا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ انہوں نے رام گڑھ
ریزولیوشن کو لوگوں کے سامنے رکھا تھا۔ یہ تو ان کے لئے عزت کا سوال
تھا۔ ستیاگرہ نہیں سکھلاتا۔ کہ ہم خاموشی سے لوگوں کو ان کی آزادی تقریر
کے حق کو استعمال کرنے کی پاداش میں جیلوں میں اس طرح ٹھونسے جاتے
ہوئے برداشت کریں۔ اگر ہم خاموش رہیں۔ تو کانگرس معدوم ہو

جائے گی۔ اور اس کے ساتھ ہی قومی روح۔ ننکانہ کے سانحہ کے موقع پر مولانا نے فرمایا تھا کہ "ہندوستان ایک وسیع جیل خانہ ہے۔ اگر ہم اسے آزاد کرلیں گے۔ تو اس کے ساتھ ہی نہ صرف ایک بلکہ تمام گوردوارے بھی آزاد ہو جائیں گے" اگر ہماری آزادی تقریر کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ تو ہمارے ملک کو بندھنوں سے آزاد کرانے کی تحریک کا بھی گلا گھٹ جائے گا۔ تب جیسا کہ میں نے پہلے کہا قوت برداشت کی خوبی برائی کی شکل اختیار کرے گی۔ خوبی کا استعمال اس حد تک جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ جیسا کہ ریزولیوشن میں بتلایا گیا ہے کہ نوبت اپنی تباہی۔ اور قومی روح کی تباہی تک۔ خواہ وہ کانگرس والوں یا غیر کانگرسیوں کے دلوں میں رہتی ہو۔ آن پہنچے"

ہم نے آپ سے سیکھا!

مہاتما جی نے بتلایا۔ کہ قوت برداشت کا مزید استعمال برطانیہ کے حق میں بھی ایک غیر دوستانہ اقدام ثابت ہوگا۔ آزادی تقریر کے بیش بہا عطیہ کی قدر کرنا ہم نے انگریزوں سے سیکھا ہے۔ مہاتما جی نے انگریزوں کے ساتھ اپنی ہمدردی جتلاتے ہوئے۔ اور انگریزوں کی بہادری کی تعریف کرتے ہوئے یہ نکتہ عجیب طریقہ پر پیش کیا "موجودہ جنگ میں ہماری تمام مظلوم قوموں کے ساتھ ہمدردی ہے۔ مجھے برطانیہ کی بھی بہتری مطلوب ہے۔ انگلستان میں ایک بچے کی بھی

تباہی میرے دل پر شاق گذرتی ہے۔ جب میں نے گرجا سینٹ
پال پر آنے والی مصیبت کا حال سنا۔ تو میرے دل کی کیفیت ایسی
ہوگئی جیسی کہ اس وقت ہوتی جبکہ میں کاشی کے وشوناتھ مندر
اور جامع مسجد دہلی پر آئی ہوئی مصیبت کی خبر سنتا۔ میں ان جذبات
سے واقف ہوں۔ جو سینٹ پال کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اسی واسطے
اس خبر نے مجھے صدمہ پہنچایا لیکن اس سے زیادہ میں اور کیا کہہ سکتا
ہوں کہ میں کہوں کہ اُس نے مجھے صدمہ پہنچایا۔ باوجود اس صدمہ کے
برطانوی لوگ کھیلتے، کودتے، ناچتے اور حسب معمول اپنا کاروبار کرتے
ہیں اور ہمیں بتلایا گیا ہے کہ ایک گیارہ سال کے لڑکے نے اپنے باپ
کو لکھا کہ۔ اپنے والدین کے ساتھ وہ انگلینڈ میں ہی ہوں تباہ ہونے کو
ترجیح دیتا ہے بجائے کینیڈا میں جاکر پناہ گزین ہونے کے۔ یہ بہادری
ان کی رگوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے اور اگر ہم نے کوئی چیز ان سے
سیکھی ہے تو وہ یہی چیز ہے۔ اور اگر لنڈن اور جزیرہ برطانیہ بھی سر ہو
جائیں تو ان میں کینیڈا، آسٹریلیا، یا نیوزی لینڈ میں بھی رہ کر جنگ جاری
رکھنے کی جرأت موجود ہے۔ لہذا آؤ ہم بھی ان کی اس بہادری کی
نقل کریں۔ اور ہمیں ہمدردی کی لہر میں اس حد تک نہیں بہ
جانا چاہیئے۔ کہ ہم اپنی فرض شناسی سے بھی غافل رہیں۔"
وہ فرض یہ ہے کہ ہم مکانات کی بلند چوٹیوں سے اعلان کردیں
کہ ہمیں اس قسم کی جنگوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہم اس جنگ

کو چلانے کے لئے آدمی روپیہ یا سامان کی شکل میں کسی قسم کی امداد بھی نہیں کریں گے وائسرائے کو دنیا میں یہ اعلان کرنے کی اجازت دینا۔ کہ سارا ہندوستان اس جنگ میں برطانیہ کے ساتھ ہے۔ اسے دنیا کو دھوکہ دینے کی اجازت دینے کے برابر ہے۔ اگر جنگ جمہوریت کے لئے لڑی جا رہی ہو۔ تو کس منہ سے ایسا دعوے کیا جا سکتا ہے جب کہ جمہوریت کا گلہ گھونٹ کر ہندوستان میں اسے کچلا جا رہا ہو؟ درجہ نوآبادیات کا تو وعدہ کیا جا رہا ہے۔ لیکن صوبجاتی خود مختاری جو ان کے اپنے ایکٹ کے ذریعہ عطا کی گئی۔ اُسے ایک مذاق بنایا جا رہا ہے۔ اپنی پُرزور ہندی تقریر میں مہاتماجی نے پوچھا۔" کیا پنجاب سے مشورہ لیا گیا؟ کیا بنگال سے مشورہ لیا گیا؛ کیا سندھ سے مشورہ لیا گیا؟ کیا صوبہ سرحد سے جس کی آبادی ۹۰ فی صدی مسلمانوں پر مشتمل ہے مشورہ لیا گیا؟ اس سے پیشتر کہ ہندوستان کو بھی جنگ کرنے والے ممالک میں شامل ہونے کا اعلان کیا گیا؟ کیا ان صوبجات کے باشندگان سے مشورہ کیا گیا۔ کہ وہ جنگ میں شامل ہونا چاہتے ہیں یا نہیں؟ ایک آدمی کو خواہ وہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو۔ کس طرح (جمہوریت کے نکتہ خیال سے) چالیس کروڑ لوگوں پر حکومت کرنے کے اس قدر وسیع اختیارات دئے جا سکتے ہیں؟ میں وائسرائے کا دوست ہوں اور تا قیامت ایسا ہی رہنے کی امید رکھتا ہوں۔ لیکن انہیں عملی طور پر ہندوستان کا ڈکٹیٹر بنا دینے سے جو حالت رونما

ہے۔ وہ ناقابل برداشت ہے۔ یہ جمہوریت ہے۔"

مطالبہ

گذشتہ ایک برس میں کانگرس کے پاس برطانیہ کے ساتھ صلح کرنے کے جس قدر ذرائع تھے۔ وہ اس نے سب آزما لئے ہیں۔ اس نے اعلان آزادی کا مطالبہ کیا۔ یہ اعلان کیا۔ کہ کانگرس مطمئن ہو جائیگی اگر برطانیہ اس آئین کو منظور کرلے۔ جو کانسٹی ٹیونٹ اسمبلی Constituent Assembly نے مرتب کیا ہو اس نے ایک تیسرا اپیل بھی پیش کیا اور اسے پیش کرتے ہوئے اس نے اپنے لئے بدنامی بھی مول لی۔ کیونکہ میری رائے میں اس نے اپنی گذشتہ بیس سالہ زندگی کے سنجیدہ راستہ سے منہ موڑ لیا۔ اس نے عدم تشدد کے ذریعہ سوراجیہ حاصل کرنے کا اقرار کیا ہوا تھا۔ اور وہ اس عہد کو بھول گئی۔ جب اس نے برطانیہ کو جنگ میں اپنا عملی تعاون پیش کرنے کی پیشکش کی۔ بشرطیکہ برطانیہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کردے۔ وہ خود اپنی تردید کرنے لگی۔ اور آزادی کی قیمت اصولی قربانی کی شکل میں ادا کرنے لگی۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کی وہ پیشکش بھی نامنظوری ہوئی۔ اب چوتھے نمبر پر موجودہ پیشکش کی جارہی ہے۔ کہ "صرف اتنا اعلان کیا جائے۔ کہ ہندوستان شانت مئی طریقوں پر کھلے بندوں جنگ کے خلاف

پراپیگنڈہ کرنے میں آزاد ہے۔ اور ہندوستان آزاد ہے۔ کہ وہ جنگ کی تیاری میں گورنمنٹ کے ساتھ عدم تعاون کی تلقین بھی کر سکے پھر ہم کسی قسم کی سول نافرمانی جاری نہیں کریں گے۔"

یہ ان کی ایمانداری کی پرکھ کے لئے کم از کم کسوٹی ہے۔ شہری آزادی جمہوریت کی جان ہے۔ اگر آپ اس سے انکار کرتے ہیں۔ تو آپ جمہوریت سے بھی انکاری ہیں۔ ابھی چند روز کی بات ہے۔ کہ ایک برطانوی جج نے جمہوریت کا ماحصل بتلایا تھا ڈیلی ورکر کے خلاف مقدمہ میں اپنا فیصلہ دیتے ہوئے مسٹر جسٹس سٹیبل نے کہا "اظہار خیالات خواہ وہ کثیر التعداد کے لئے کتنے ہی ناپسندیدہ کیوں نہ ہوں کتنے ہی جوشیلے اور غلط کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں۔ ایک حق ہے۔ اور ایسا حق ہے۔ جس کی حفاظت کے لئے میرے جیسے کئی ایک آدمی تنخواہ پاتے ہیں۔ میں کلیتہً ان الفاظ سے متفق ہوں جو ڈیفنس کونسل مسٹر ڈی۔ این۔ پرٹ۔ کے۔ سی کے منہ سے نکلے ہیں۔ کہ "ایسے خیالات جو چند آدمیوں کے ہوں۔ ایسے خیالات جو ناپسندیدہ ہوں اور پھر ایسے خیالات جو کثیر التعداد انسانی جماعت کے خیالات سے بالکل برعکس ہوں۔ خصوصاً ایسے اوقات پر جب کہ قومی جذبات میں گڑبڑ واقع ہو چکی ہو۔ یعنی جنگ وغیرہ کے موقع پر ایسے ہی خیالات کی اس عدالت کو خاص سرگرمی سے حفاظت کرنی چاہئے۔" اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ ہندوستان میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ انتہائی

جمہوری اصولوں کے بالکل منافی ہے۔

مہاتما گاندھی جی نے اسے اپنے سادے اور صریح الفاظ میں یوں بیان کیا "۔ اپنی پوزیشن کو مکمل طور پر واضح کرنے کے واسطے میں والسرائے کے پاس پہنچنے کی تجویز رکھتا ہوں۔ اگر انہوں نے برائے مہربانی مجھے شرف ملاقات بخشا اور مجھے اس میں ذرا بھی شبہ نہیں کہ وہ ضرور ایسا کریں گے۔ تاکہ میں اپنی مشکلات ان کے سامنے رکھ سکوں۔ میں آپ کے نام پر ان کے پاس جاؤں گا۔ میں انہیں بتلادوں گا۔ کہ اب ہمارا مطالبہ اس درجہ تک کم کر دیا گیا ہے۔ ہم آپ کو تنگ نہیں کرنا چاہتے۔ اور نہ ہی آپ کو اپنی جنگی کوششوں کی تیاری سے گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اپنے راستہ پر چلتے رہے ہم اپنے راستہ پر چلتے جائیں۔ بے روک ٹوک ہمارے درمیان اشتراک عمل کا میدان عدم تشدد رہے گا۔ اگر ہمارا مشورہ قبول ہو جائے۔ تو ہم لوگوں کو جنگی تیاریوں کی کوئی ضرورت نہ رہے گی۔ لیکن بخلاف اس کے۔ اگر ہمارے اخلاقی اور خالص اخلاقی دباؤ کے باوجود کوئی امداد کرنا چاہیے تو ہم مجبور ہیں۔ اگر آپ راجوں مہاراجوں زمینداروں یا دیگر چھوٹے موٹے آدمیوں سے کوئی امداد حاصل کر سکتے ہیں۔ تو بڑی خوشی سے حاصل کریں۔ لیکن ہماری آواز کو بھی نہ دباویں۔ اگر آپ اس طریقہ پر کاربند ہوں۔ تو یہ ایک نہایت ہی معززانہ طریقہ ہوگا۔ اور یقیناً آپ کے لئے ایک طرہ امتیازی بن جائے گا۔ آپ کے لئے یہ

ایک شاندار چیز ہو گی - کہ باوجود زندگی اور موت کی جدوجہد میں مصروف ہونے کے - آپ نے اس حق آزادی کو تسلیم کیا - آپ کا یہ بھی ایک شاندار کارنامہ ہو گا - اگر آپ باوجود ہمارا گلا گھونٹنے کی طاقت رکھنے کے ہمیں اجازت دیتے ہیں - کہ ہم عدم تشدد پر کاربند ہوتے ہوئے لوگوں کو جنگی تیاریوں میں امداد نہ پہنچانے کے لئے کہہ سکیں -

یہ پوزیشن ہے - جس میں کانگریس اور برطانوی گورنمنٹ دونو پرامن طور پر باہمی تعلقات جاری رکھ سکتے ہیں - جیسا کہ مہاتما جی نے کہا - " تو برطانیہ دنیا کے لوگوں کو صاف کہہ سکے گا - کہ آپ ہمیں ہمارے عمل سے جانیئے - آؤ دیکھو ! ہندوستان میں ہمارا عمل کیسا ہے ! "

آزادی کا کیا بنے گا؟

پھر یہ سوال پوچھا جائے گا - کہ ہمارے مطالبہ آزادی کا کیا بنے گا؟ جنگی تیاریوں کے ساتھ عدم تعاون کے اعلان اور پرچار کے حق کو تسلیم کرنے میں آزادی خود بخود شامل ہے - اپنی تقریر کے خاتمہ پر مہاتما جی نے کہا - " یہی آزادی ہی ہمارے سوراجیہ کی بنیاد ہے " اگر یہ بنیادی پتھر ہی خطرہ میں ہو - تو آپ کو اس ایک پتھر کی حفاظت میں اپنی ساری قوت خرچ کرنی ہو گی -

اس خیال کی اپنی اختتامی تقریر میں انہوں نے وضاحت کی۔
"مجھے افسوس ہے۔ کہ آپ کا دماغ ایک نہایت ہی سادہ لیکن نہایت ہی اہم نکتہ کو سمجھنے سے قاصر رہا ہے۔ جیسے میں نے کل آپ کے سامنے پیش کیا تھا۔ میں نے آزادی تقریر کو سوراجیہ کا بنیادی پتھر بیان کیا تھا۔ تو میں اس کی تشریح کرتا ہوں۔ سوراجیہ کی تکمیل تعریف ابھی تک مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ میرا خیال ہے۔ میں خود ایسا کرنے سے قاصر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے آج تک جواہر لال جی بھی ایسا نہیں کرنے پائے۔ یہ عین قرین قیاس ہے کہ شاید آپ میں سے ہی کوئی ایسا کرنے کے قابل ہو سکے۔ کیونکہ بہت دفعہ ایسا اتفاق ہوا ہے۔ کہ جن چیزوں کا حل مجھے باوجود سخت کوشش کے نہ ملا تھا۔ دوسروں نے مجھے اس کا حل سمجھایا۔ اگر کوئی ایسا کر سکے تو میں بخوشی اسے اپنا گورو تسلیم کر لوں گا۔ لیکن اس ریزولیوشن میں سوراجیہ کا بیج موجود ہے۔ اگر آپ اسے مضبوطی سے پکڑے رکھیں۔ تو وہ سب کچھ جو مختلف ترامیم کے محرک صاحبان چاہتے ہیں خود بخود حاصل ہو جائے گا۔ اگر ہم آزادی تقریر کا یہ حق حاصل کر لیں۔ خواہ لڑ کر خواہ بذریعہ گفتگو تو ہمیں سب کچھ مل جائے گا۔ آزادیٔ تقریر ڈاکٹر اشرف جیسے کمیونسٹوں کے لئے اور آزادیٔ تقریر سردار سردول سنگھ جیسے فارورڈ بلاک والوں کے لئے۔ اگر میں اسے مذہبی رنگ میں پیش کر سکوں تو میں

کہوں گا۔ کہ یہ مکمل مذہبی آزادی ہو گی۔ ایسی معاشرتی و مذہبی آزادی جس کے مسلمان طلبگار ہیں۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ کو آزادی چاہیئے۔ لیکن آپ یہ بھول جاتے ہیں۔ کہ ہمیں آزادی دینا ان کی طاقت سے باہر ہے۔ نہ ہی ہم صرف اعلان کر دینے سے آزاد ہو سکتے ہیں۔ ہم آزاد صرف اس حالت میں ہو سکتے ہیں۔ جب کہ انگریزوں کے چلے جانے کے بعد ہم بلا خوف اپنی حکومت خود چلا سکیں۔ اور ہمیں کسی غیر ملک مثلاً جاپان۔ جرمنی۔ روس یا افغانستان کے بیرونی حملہ کا کوئی خطرہ نہ رہے۔ آزادی کے لیئے آج سول نافرمانی شروع کرنا لغو ہو گا۔ ہم آزادی کے لیئے ان لوگوں کے خلاف کس طرح جنگ کریں۔ جن کی اپنی آزادی سخت خطرہ میں ہے؟ اگر ایک قوم کا دوسری قوم کو آزادی دے دینا ممکن بھی ہو۔ تاہم یہ انگریزوں کے لیئے ممکن نہیں۔ وہ جو خود تباہی کے منہ میں جا رہے ہوں۔ دوسروں کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ وہ خود اگر آخری دم تک اپنی حفاظت آزادی کے لیئے لڑ سکتے ہیں۔ تو اگر وہ ذرا بھی بچار سے کام لیں۔ تو انہیں ہمارا آزادی تقریر کا حق بھی تسلیم کر لینا چاہیئے۔ اتنا وہ یقیناً کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اس آزادی کے لیئے لڑیں۔ اگر وہ انکار کریں۔ اور ہمیں لڑنا پڑا۔ اور ہمارا یہ خلل ان کے لیئے پریشانی کا موجب بنا۔ تو یہ پریشانی ان کی خود مدعو کردہ

ہو گی“

اس قسم کی آزادی ایک ابتدا صاف مسئلہ ہے۔ جس کی تشریح کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ آزادی کی بنیاد ہے۔ خصوصاً جب یہ شائنتگی طریقہ پر حاصل کرنی ہے۔ اس حق کو ترک کر دینا حصول آزادی کے واحد ہتھیار کو ترک کرنے کے مترادف ہو گا۔

”جب راجاجی نے مجھے یہ کہا کہ ان کی پیشکش بمقابلہ میری پیشکش کے انگریزوں کے لئے قبول کرنا آسان تھی۔ تو انہوں نے صرف نیم راستی کا اظہار کیا۔ فی الواقعی ہماری آزادی کو تسلیم کرنا ان کے لئے آسان ہے۔ مگر مرکز میں ذمہ دار گورنمنٹ عطا کرنے میں خصوصاً دوران جنگ میں اس کے تامل کو میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں۔ کیوں کہ اگر ایک دفعہ یہ منظور کر لیں۔ تو پھر انہیں ہمارے ذریعہ سب کام چلانا پڑے گا۔ ایک دن یہ کام راجاجی کے سپرد ہو گا۔ دوسرے دن پنڈت جواہر لال کے۔ اور پھر دا مودر مینن کے۔ یہ تعاون جو ہم ان کو پیش کرتے ہیں۔ ان کے لئے یہ ایک مشکوک چیز ہے۔ کیوں کہ وہ ہم پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ اور اگر دوسرے کی پوزیشن میں، میں خود ہوتا۔ تو میں بھی ان شبہات کو سمجھ سکتا۔ اس کے لئے جنگ کو جاری رکھنا ان لوگوں کے ذریعے جن پر انہیں اعتماد نہ ہو۔ سخت خطرناک ہے۔ لیکن اس بات میں کیا خطرہ ہے؟ کہ وہ ہر ایک آدمی کو کھلی آزادی دیں۔ کہ وہ

جنگ میں تعاون نہ کرے۔ اور ہر ایک آدمی کو ایسا عدم تعاون کرنے کے لئے تلقین بھی کر سکے۔ بشرطیکہ وہ تلوار کی نوک سے تعاون حاصل کرنے کے خواہش مند نہ ہوں؟

حد بندی کی واحد شرط

لیکن جو حق ہم منوانا چاہتے ہیں۔ اس شرط کے ماتحت ہے کہ ہم عدم تشدد کے پابند رہیں" یہ شرط لازمی ہے۔ کیوں کہ حکومت تشدد پر قائم ہے۔ وہ تشدد کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ تشدد کا لازمی منطقی نتیجہ ہے۔ مگر وہ لوگ جو تشدد کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ انہیں بھی مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر وہ آج میری بات سنیں۔ اگر ہم عدم تشدد کے ذریعہ سوراجیہ حاصل کرلیں تو تشدد والوں کو بھی اگر کوئی ہوں کھلی اجازت ہوگی۔ کہ وہ نہ صرف تشدد کی تلقین ہی کر سکیں۔ بلکہ اس پر عمل بھی کر سکیں۔ یہاں پر کوئی فوج نہ ہوگی۔ لیکن وہ کسی سکھ یا خاکسار کو تلوار یا تلواریں رکھنے سے نہ روکے گی۔ اگر باقی سب لوگ عدم تشدد کے پابند ہوں۔ تو یہ لوگ کتنا تشدد کر سکیں گے؟ کثیر التعداد کی تقریر اور عمل پر پابندی قلیل التعداد مخالف خیال رکھنے والوں پر خود بخود عمل میں آجاتی ہے۔ بہر حال اگر مجھے اختیارات مل جائیں۔ تو میں بطور پریذیڈنٹ شانت مئی ہندوستانی

جمہوریت۔ تشدد کا میلان رکھنے والوں کو پرتشدد تقریر کرنے کی کھلی آزادی دیدونگا۔ بخلاف اس کے میں انہیں یہ بھی بتلا دینا چاہتا ہوں۔ کہ پرتشدد نظام حکومت میں وہ ایسی آزادی کی امید نہیں رکھ سکتے۔

"میں ان لوگوں کو جو اجتماعی سول نافرمانی۔ ہڑتالیں اور عدم آدائیگی ٹیکس کے خواہش مند ہیں۔ بتلانا چاہتا ہوں۔ کہ یہ سب چیزیں تو پہلے ہی ہمارے ۱۹۲۰ء کے ریزولیوشن میں موجود ہیں۔ اسے انہیں نہ بھولنا چاہیئے۔ سچ پوچھیں تو میں انہی چیزوں کے لئے ہی ملک کو تیار کرنے کے لئے اتنے عرصہ سے لگا ہوا ہوں۔ ہم آج تک یہ سب کچھ کر چکے ہوتے۔ اور ایک نیا مجلسی نظام قائم کر لیتے۔ اگر ہم نے فقط شرائط کی پابندی کی ہوتی۔ اگر ہم شرائط کی پابندی نہیں کر سکے اور تیار نہیں ہوئے تو اس کے لئے سوائے ہمارے اور کس کا قصور ہے"

"لیکن اگر آپ پسند کریں۔ تو آپ اجتماعی سول نافرمانی کو منظم کرنے میں آزاد ہیں۔ ہاں اس صورت میں آپ پر بیقاعدگی کا الزام ضرور لگ سکے گا۔ لیکن جیسا میں نے سوبھاش بابو کو کہا تھا۔ جب انہوں نے مجھ سے یہی سوال کیا۔ کہ اگر آپ کامیاب ہو گئے۔ تو میں آپ کو مبارکباد دوں گا۔ لیکن میں آپ کو آشیرباد نہیں دے سکتا۔ البتہ اس حالت میں آپ کے لئے شریفانہ طریقہ

تو یہ ہوگا۔ کہ آپ کانگرس کو چھوڑ دیں۔

لیکن آپ جانتے ہیں۔ کہ اس مرحلہ پر اجتماعی سول نافرمانی آپ بغیر تشدد کے منظم نہیں کر سکتے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر میں طلباء کو بھی یہی مشورہ دے رہا ہوں۔ کہ وہ محض سول نافرمانی کے لئے کالجوں کو نہ چھوڑیں۔ جب تک کہ وہ ہمیشہ کے لئے ان کو نہ چھوڑ سکیں۔ یہی حال ہڑتالوں کا بھی ہے۔ ڈاکٹر سریش بنرجی نے جو کبھی ساتھی کارکن تھے۔ لیکن جو چند سالوں سے میرا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ اور پھر دوبارہ واپس آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا مجھ سے کہا تھا۔ کہ میں صرف مزدوروں کی ہڑتال کو ہی کامیاب بنا سکتا ہوں۔ میں یہ تمام باتیں تبھی کر سکوں گا۔ جب آپ میری پوری پوری امداد کریں اور قواعد کی مکمل پابندی کریں۔"

نتیجہ

فوری نتیجہ کے متعلق گاندھی جی نے کہا "کہ جب ہم خود مختار ہو جائیں۔ تو حکومت پر نہ صرف کانگرسیوں کے متعلق بلکہ غیر کانگرسیوں کے متعلق بھی ذمہ داری عائد ہوگی۔ تمام بالغوں کو ووٹ حاصل ہو جائے گا۔ بالغ ووٹروں کے نمائندے ہی گورنمنٹ بنا سکیں گے۔ ان میں ہندو مسلمان۔ عیسائی۔ پارسی اور وہ بھی شامل ہوں

گے۔ جنہیں ہم بے وقوفی سے اچھوت سمجھ رہے ہیں۔ جو کچھ ان سب کی مشترکہ پارلیمنٹ کرے گی۔ وہ میں نہیں جان سکتا۔ لیکن میں امید رکھتا ہوں۔ کہ کانگرس کا ووٹ ہمیشہ عدم تشدد کے حق میں ہوگا۔ اگر کانگرس قلیل التعداد رہی تو اپنا ووٹ ریکارڈ کرائے گی۔ اور اگر کثیر التعداد ہوئی۔ تو حکومت کا نظام عدم تشدد کے طریقہ پر چلائے گی۔ کیوں کہ بطور کانگرس اور کچھ نہیں کر سکتی۔ فرض کیجئے کہ گورنمنٹ کل ہی ہمارا مطالبہ تسلیم کر لیتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ آئندہ جو جی چاہے کیجئے۔ لیکن اس وقت برائے مہربانی ہمیں آدمی اور روپیہ سے امداد کیجئے میرا خیال ہے۔ کہ ایسی حالت میں بھی ہمیں یہی جواب دینا ہوگا "افسوس ہے۔ ہم تعاون نہیں کر سکتے۔ ہم آپ کی بہتری کے طالب ہیں۔ خدا تمہاری مدد کرے۔ لیکن ہم جن حالات میں عدم تشدد کے پابند ہیں۔ آپ کا کوئی بھی پیشکش ہمیں آپ کی پر تشدد امداد کے لئے آمادہ نہیں کر سکتا۔"

اس وقفہ میں جو گاندھی جی کو وائسرائے سے ملاقات کر کے واپس آنے میں لگے گا۔ کیا کرنا چاہیئے؟ گاندھی جی نے کہا "میں وائسرائے سے ملاقات کرنے جا رہا ہوں۔ لیکن میں اپنے مشن میں ناکامیاب بھی ہو سکتا ہوں۔ مگر میں نے مایوسانہ طور پر کبھی کوئی اقدام نہیں کیا۔ میں نے اس کو اس علم کے

ساتھ اختیار کیا ہے۔ کہ ممکن ہے مجھے سیاہ دیوار کا سامنا کرنا پڑے۔ لیکن میں نے بہت دفعہ سیاہ دیواروں کو چیرا ہے لیکن اگر میں ناکام بھی رہا۔ تو بھی ہم مخالف جنگ پراپیگنڈا آزادانہ طور پر جاری رکھیں گے۔ اور نتائج بھگتنے کو تیار رہیں گے۔ ویسے تو آپ اس پراپیگنڈا کو جاری کرنے کے لئے ابھی سے آزاد ہیں۔ لیکن ایسا کرنا معقول نہ ہوگا۔ یہ برداشت کے خلاف ہوگا۔ لہذا میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔ کہ آپ وائسرائے سے مل کر میرے واپس آنے تک صبر سے انتظار کریں۔

جب میں یہ واقعات قلمبند کر رہا ہوں۔ تو ورکنگ کمیٹی نے مفصلہ ذیل ریزولیوشن پاس کر دیا ہے۔ جس میں اس وقفہ کے دوران میں کانگرسیوں کے فرائض کو واضح کیا گیا ہے۔

"آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے حال ہی کے پاس شدہ ریزولیوشن کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ ورکنگ کمیٹی تمام کانگرسی نظام سے مطالبہ کرتی ہے۔ کہ وہ ہر قسم کی سول نافرمانی۔ خواہ انفرادی ہو۔ یا دوسری۔ جب تک مہاتما گاندھی جی کی مخصوص ہدایات موصول نہ ہوں۔ تب تک بالکل بند کر دیں۔ مہاتما جی اس تعطل کو وائسرائے سے ملاقات کے پیش نظر ناگزیر خیال کرتے ہیں۔

اور اس سے رجسٹرڈ وغیر رجسٹرڈ کانگرسیوں و دیگر ہم خیالان کانگرس مرد و عورتوں کے پابند قواعد ہونے کی آزمائش ہو جائیگی مزید براں پابندی قانون کا یہ ایک چھوٹا کورس ثابت ہوگا۔ اگر سول نافرمانی لازمی ہو گئی۔"

ہندو۔ مسلم سوال

اپنی اختتامی تقریر میں گاندھی جی نے ہندو مسلم مسئلہ کا بھی ذکر کیا۔ کیونکہ دوران بحث میں یہ بھی پیدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے کہا" اگر فساد ہماری قسمت میں ہی لکھا ہے۔ تو اسے کون روک سکتا ہے، ہمیں بغاوت اور گڑبڑ کے لئے بھی تیار رہنا چاہئے لیکن یہ یقین رکھنا چاہئے۔ کہ عدم تشدد کا نتیجہ کبھی گڑبڑ نہیں ہو سکتا۔ اور اگر کسی نہ کسی طرح گڑبڑ پیدا ہو بھی جائے۔ تو ہمارے عدم تشدد کے عقیدہ کی آزمائش ہو گی۔ عدم تشدد ایک ایسی طاقت ہے۔ جو اتنی ہی قوت میں بڑھتی جاتی ہے۔ جتنی کہ اس بڑھتے ہوئے تشدد کے لئے ضروری ہو۔ جس کا اسے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ میں امید رکھتا ہوں۔ کہ آپ کو عدم تشدد کی یہ طاقت حاصل ہو جائے گی۔ پیشتر اس کے کہ میری موت ہو جائے۔ لیکن میرا ایک پیغام ہے۔ جو میں چاہتا ہوں۔ ہر ایک مسلمان کے کانوں تک پہنچنا چاہئے۔ ہندوستان سوراجیہ حاصل نہیں کر سکتا۔ اگر آٹھ

یا نو کروڑ مسلمان اس کے مخالف ہوں۔ لیکن میں یہ نہیں مان سکتا
کہ سارے مسلمان مخالف ہیں۔ جب تک ووٹ بالغان کی بنا پر تمام
مسلمانوں کے نمائندے ایسا ثابت نہ کر دیں۔ ان کو اعلان کر دینا
چاہیئے۔ کہ وہ اپنی سیاسی نجات ہندوؤں کی نجات سے الگ رہ
کر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ہندوستان ایک عجیب ملک ہے۔
جس میں ہندو، مسلمان و دیگر فرقہ جات رہتے ہیں۔ جو اس
کے ہر ایک کونہ میں آباد ہیں۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کرنا لغاوت
سے بھی بدتر ہو گا۔ یہ ایک ایسی تقسیم ہے۔ جو برداشت نہیں
کی جا سکتی۔ اس لئے نہیں کہ میں ایک ہندو ہوں۔ کیوں کہ میں
اس پلیٹ فارم سے ہندو مسلم پارسی و دیگر تمام فرقوں کی مشترکہ
نمائندگی کرتا ہوں۔ لیکن میں انہیں پکار کر کہہ دوں گا۔ کہ ہندوستان
کو بانٹنے سے پہلے میرے جسم کو بانٹو! آپ کو وہ کام عمل
میں نہ لانا چاہیئے۔ جو مغل بھی جنہوں نے ہندوستان پر دو
صدی سے زائد عرصہ تک حکومت کی۔ عمل میں نہ لائے
جو کچھ میں نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا ہے۔ وہی لفظ
بلفظ سکھوں کے لئے بھی ہے۔ اگر تیس لاکھ سکھ ہندوستان
کی آزادی میں روکاوٹ ڈالیں گے۔ تو ہم ان کے ساتھ بھی
شانت مئی طریقہ پر ہی برتاؤ کریں گے۔ شانت مئی سوراجیہ
سوائے شانت مئی طریقوں کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور

بھی روکاوٹیں موجود ہیں۔ جو غیر ملکی حکومت کی موجودگی سے پیدا شدہ ہیں۔ لیکن ہمیں فرقہ وارانہ امن حاصل کرنے کے لئے اپنا پورا زور لگا دینا چاہئے۔ اسلام کے معنے امن کے ہیں۔ وہ امن صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ لازماً اس کے معنے ساری دنیا کے امن کے ہیں۔

ریزولیوشن کی تشریح

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس کے اختتام کے ۲۴ گھنٹہ کے اندر اندر امریکن ایسوشی ایٹڈ پریس کا نمائندہ مہاتما جی سے بمبئی میں ملا۔ اس نے کہا۔ "ہمارے ملک کے سینکڑوں اخبارات نے آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے ریزولیوشن کو شائع کیا ہے۔ اور آپ کی تقاریر کا اختصار بھی جو یہیں نے بذریعہ تار روانہ کیا تھا۔ شائع کیا گیا ہے۔ اور ان پر رائے زنی بھی کی ہے۔ اس رائے زنی سے چار سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ جن کے جوابات میں آپ سے حاصل کرنا چاہتا ہوں۔" گاندھی جی کانوں تک کام کے انبار میں دھنسے ہوئے تھے۔ اور جس وقت مسٹر سٹمسن پہنچے وہ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں

شمولیت کر رہے تھے۔ گاندھی جی نے اجلاس کو روک لیا اور ان چار سوالوں کے جوابات تحریر کرا دئے

پہلا سوال یہ تھا۔" آپ کس طرح یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ آپ برطانیہ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے، جب آپ جنگ کے خلاف شانت مئی طریقہ پر پرچار کرنے کی آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں"؟

گاندھی جی کا جواب:۔" چونکہ عدم تشدد کانگرس کا عقیدہ ہے۔ جس میں جنگ سے کانگرس کی دشمنی بھی شامل ہے۔ لہذا کانگرس کے لئے کسی قسم کی جنگ میں شمولیت سے پرہیز رکھنا اس کا فرض منصبی ہو جاتا ہے۔ لہذا میری برطانیہ کو پریشان نہ کرنے کی بھی خواہش لازماً موجود ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ کانگرس کو بھی زندہ رکھنا ہے۔ اور اسی لئے سول نافرمانی کا دائرہ عمل آزادئے تقریر و عمل تک محدود رکھا گیا ہے۔ بشرطیکہ یہ شانت مئی طریقہ پر عمل میں لائے جاویں۔ اسی واسطے میں نے اپنی تقریر میں یہ بھی دعوے کیا ہے۔ کہ اگر کانگرس کے عمل کا پورا پورا مفہوم سمجھ میں آجائے۔ تو یہ لازماً آخر کار برطانیہ اور تمام دنیا کے لئے مفید ثابت ہو گا"

سٹمسن نے حیران ہو کر پوچھا۔ "وہ کیسے؟"

"کیونکہ چاروں اطراف سے بھڑکتی ہوئی آگ میں صرف ایک ہی طاقت در "جماعت ایسی ہے۔ جسے عدم تشدد میں پورا پورا اعتماد ہے۔ اگر یہ جماعت کامیاب ہو جائے۔ تو پھر اس بلکتی ہوئی دنیا کو ان قوی ہیکل ہتھیاروں کے چنگل سے چھٹکارا حاصل کر کے آرام کا سانس لینے کا ایک راستہ دستیاب ہو جائے گا۔

دوسرا سوال یہ تھا۔ "نازیوں کی فتح کی صورت میں ہندوستان کے مستقبل کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"

جواب:۔ جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں وہ یہ ہے۔ مجھے آئندہ کے متعلق کوئی پریشانی نہیں۔ اگر میرا ملک صادقانہ طور پر عدم تشدد کا پابند رہا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں۔ کہ میں نازی فتح پر کسی طرح خوش ہوں۔ مجھے جو خطرہ اس وقت لاحق ہو رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ موجودہ حالات میں نازی ازم پر فتح خطرناک قیمت پر خریدی جائے گی۔ یعنی زبردست نازی ازم کے ذریعہ۔ خواہ آپ اُسے کوئی نام دے دیں۔ جو آپ کو پسند ہو۔

تیسرا سوال:۔ جو کچھ مالابار میں ظہور پذیر ہوا اُسے مدنظر رکھتے ہوئے متانت مئی طور پر اجتماعی سول نافرمانی جاری

رکھنے کی کوئی اُمید کی جا سکتی ہے؟

جواب:- موجودہ حالات میں نہیں۔ اور اسی لئے آپ نے میری تقریر میں نوٹ کیا ہوگا۔ کہ میں نے زور دار الفاظ میں اعلان کر دیا۔ کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ مجھے اجتماعی سول نافرمانی جاری کرنے کی قطعی امید نہ رکھنی چاہیے لیکن اگر آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا اجتماعی سول نافرمانی کی کوئی صورت ایسی ممکن بھی ہو سکتی ہے۔ جس کا نتیجہ تشدد نہ ہو، تو میں زور دار الفاظ میں یہ کہوں گا۔ کہ "ہاں"! لیکن میرے ملک کے لوگ آج اجتماعی حکم کے لئے تیار نہیں ہیں اور ایک طرح پر میں ممنون ہوں۔ کہ مالا بار جیسے بدقسمت واقعات بطور آگاہی ملک کے سامنے آئے ہیں۔ اور میرے لئے بھی بطور ایک اشارہ کے ہیں۔

مسٹر سٹمسن کا آخری سوال یہ تھا۔ "کیا آپ کی پالیسی کے معنے یہ ہیں۔ کہ آپ امریکہ کی برطانیہ کو ہوائی جہازوں اور سامان جنگ کی شکل میں امداد کرنے کو ناپسند کرتے ہیں؟

جواب:- قطعاً نہیں! کیونکہ صریحاً امریکہ تو عدم تشدد میں عملی اعتقاد نہیں رکھتا۔ جیسا کہ کانگرس رکھتی ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ امریکہ یہ اعتقاد رکھتا۔ ایسی صورت میں امریکہ کا حصہ امن پیدا کرنے میں اور برطانیہ کو امداد دینے

ہیں بے اندازہ وزندار ثابت ہوتا - یہ نسبت اس امداد کے جو امریکہ بے شمار ہوائی جہازوں اور لا انتہا مقدار سامان جنگ کی صورت میں برطانیہ کو دے سکتا ہے - اور اگر ہفتہ واری خط وکتابت جو امریکہ سے میری ہو رہی ہے - اور وہ ملاقاتیں جو امریکن مجھ سے کرنے آتے ہیں - امریکن رائے کی آئینہ دار ہیں - تو مجھے امید ہے - کہ امریکہ کانگرس کی کتاب سے ہی ایک ورق حاصل کر کے کانگرس سے آگے نکل جائے گا - اس دور میں جو روئے زمین پر امن قائم کرنے کے لئے جاری ہے بذریعہ عام ترک ہتھیار کی پالیسی کے -

کیا میں یکساں رہا ہوں؟

دی نیوز کرانیکل کے نامہ نگار نے بمبئی میں جب مہاتما جی سے ملاقات کی تو وہ تاریخ ۸ ستمبر کو تھی - جب کہ پہلی رات کی کم نیند کے علاوہ سارا دن بھاری بھرکم کام کے بوجھ سے گاندھی جی تھکے ماندے تھے - اور ابھی اور بھی بہت سی مصروفیات سرانجام دینے کو سامنے موجود تھیں - لیکن چونکہ اس نے برطانوی لوگوں کی طرف سے ایک سخت معمہ پیش کیا تھا لہذا گاندھی جی نے اس کے لئے وقت نکال کر پہلے اس کے سوال کا جواب دیا - جو ذیل میں دیا جاتا ہے -

سوال :- آپ نے جب برطانوی لوگوں کی مصیبت میں ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا۔ اس میں کیا آپ نے اس امر کو نہیں بھانپا۔ کہ آپ کے پہلے فیصلہ جات اور موجودہ فیصلہ میں عدم یکسانیت پائی جاتی ہے؟

جواب :- گاندھی جی نے کہا۔ کہ میرا خیال تھا۔ کہ میں نے اپنی تقریر میں اپنی پوزیشن کو صاف اور کافی طور پر واضح کر دیا ہے۔ بدیں خیال کہ مجھ پر عدم یکسانیت کا الزام لگایا جائیگا۔ اگر اس میں کوئی عدم یکسانیت پائی جاتی ہے۔ تو اس خاص سلسلہ میں وہ بوجہ تبدیلی حالات کے ہے۔ میری ہمدردی نہ صرف یہ کہ وہی ہے۔ جو شملہ میں بوقت اعلان جنگ ظاہر کی گئی تھی۔ بلکہ اس سے بھی گہری ہو گئی ہے۔ کیونکہ اس وقت جو کچھہ تصور میں تھا۔ اب زوردار طور پر عمل میں نمودار ہو چکا ہے۔ تقریباً ایک سال گذرا میں نے شملہ میں برطانیہ پر نازل ہونے والی مصیبت کے خیال پر اظہار رنج کیا تھا۔ آج وہ خوفناک چیز نازل ہو چکی ہے۔ اور ابھی تک ہو رہی ہے۔ میں طبعاً اس قسم کا مزاج رکھتا ہوں۔ کہ ہر قسم کی مصیبت مجھے صدمہ پہنچاتی ہے۔ بلا لحاظ اس امر کے کہ وہ کنہی لوگوں پر نازل ہوئی ہے۔ لیکن میری ہمدردی اگرچہ وہ آج بہ نسبت ایک سال پہلے کے زیادہ گہری ہے۔ بلا شک وشبہ تبدیل شدہ شکل میں

ہے۔ میں گورنمنٹ کے تازہ اعلانات کے لئے تیار نہیں تھا اور میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ میری خلوص ہمدردی ہی ہے۔ جس نے مجھے ایسی صورت میں واقعات کو رکھنے پہ تیار کیا ہے۔ جسے برطانیہ آسانی سے جان سکتا ہے اور بلا روک وٹوک تیاری جنگ میں بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ میں یہ تو فوراً تسلیم کر لیتا ہوں۔ کہ ان لوگوں کے خلاف جنگ کرنے کی ذمہ واری میں نہیں لے رہا۔ جو برطانیہ کی شہنشاہیت اور جو اس کے لوازمات ہیں۔ اس کے مستقل دشمن ہیں۔ اس کی وجہ خاص ہے۔ اور اس لئے میں نے محسوس کیا۔ کہ اگر کانگرس پریشان نہ کرنے کی پالیسی جو اس کے عدم تشدد میں مخفی ہے۔ اسے جاری رکھے۔ تو اس کے لئے فی الحال آزادی کی خاطر براہ راست اقدام کے ذریعہ جدوجہد کو بند کرنا لازمی ہوگا۔ لیکن آزادی تقریر وعمل تو جمہوریت کے پران ہیں۔ عدم تشدد کو بطور جنگ کے بدل کے پرچار کرنے کی آزادی ایک نہایت ہی موزونیت رکھنے والی بات ہے جب ہم دیکھتے ہیں۔ کہ یورپ کی جنگی اقوام نے ایک نامعقول وحشت برپا کر رکھی ہے۔ کانگرس بطور ایک حامی امن جماعت خیال کئے جانے کے تمام حقوق کھو بیٹھے گی۔ اگر وہ بوجہ غلط ہمدردی یا اس سے بھی زیادہ ذلیل وجہ یعنی خوف نتائج کے

خیال سے انسانیت سوز حالات کے خلاف جو یورپ میں جاری ہیں۔ جدوجہد کرنا چھوڑ دے۔ اور وہ حالات ایسے ہیں۔ کہ اگر کسی شخص یا جماعت کی طرف سے انہیں روکا نہ گیا۔ تو ساری دنیا میں پھیل جائیں گے۔ مجھے امید ہے۔ کہ کانگرس کی پالیسی کے متعلق یہ بیان جو میں نے بطور واحد رہنما اس کی تشریح کرتے ہوئے دیا ہے۔ نہ صرف برطانوی پبلک رائے کی تسلی کرے گا۔ بلکہ برطانوی رائے کو کانگرس کے حق میں صف آرا کر دے گا۔ جس سے کہ وائسرائے صاحب کانگرس کے دعوے کی معقولیت کو سمجھ سکیں۔ جو دعوے کانگرس صرف اپنے لئے نہیں۔ بلکہ آزادی تقریر کے لئے کرتی ہے۔ خواہ اُسے کوئی بھی کیوں نہ استعمال میں لاوے۔ بشرطیکہ وہ کسی شکل وصورت میں تشدد پیدا کرنے کا موجب نہ بنے۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا ریزولیوشن

اوپر کے مضمون کی پوری اہمیت اور مضمون کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ ریزولیوشن جس کے متعلق مہاتما گاندھی جی نے مذکورہ بالا تقریریں کیں۔ یہاں نقل کر دیا جائے یہ ریزولیوشن آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ

بمبئی مورخہ ۱۶ ۹/۴۲ میں پاس کیا گیا۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ان واقعات پر جو اس کے گذشتہ اجلاس منعقدہ پونا مورخہ ۲۷ جولائی ۱۹۴۰ء کے بعد وقوع پذیر ہوئے۔ اور ان ریزولیوشنوں پر بھی جو ورکنگ کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ ماہ اگست میں بمقام واردھا پاس کئے پوری احتیاط کے ساتھ غور کیا ہے کمیٹی ان ریزولیوشنوں کی تصدیق و تائید کرتی ہے۔ برطانوی لوگوں کے تعاون سے ہندوستان میں پیداشدہ موجودہ تعطیل (Dead loca) کو ختم کرنے اور قومی تحریک کی ترقی کی غرض سے ورکنگ کمیٹی نے مہاتما گاندھی جی کے تعاون کی قربانی دے کر بھی اپنے دہلی ریزولیوشن مورخہ ۴۰/۷/۷ کے ذریعہ گورنمنٹ برطانیہ کے سامنے ایک تجویز پیش کی۔ جس کی تصدیق بعد ازاں آل انڈیا کانگرس نے پونا میں کر دی تھی۔ اس تجویز کو برطانوی گورنمنٹ نے رد کر دیا۔ ایک ایسے طریقہ پر جس سے اس بات کا رتی بھر بھی شک و شبہ نہیں رہ گیا۔ کہ وہ ہندوستان کی آزادی کو تسلیم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ اور جہاں تک بن پڑے۔ وہ اس ملک کو برطانوی لوٹ گھسوٹ کے لئے ابد تک غلام بنائے رکھے گی برطانوی

گورنمنٹ کا یہ فیصلہ ظاہر کرتا ہے۔ کہ وہ اپنی مرضی ہندوستان پر زبردستی ٹھونسے گی۔ اور ان کے حال ہی کے رویہ نے مزید واضح کر دیا ہے۔ کہ انہوں نے کثیر التعداد ہندوستانیوں کی خلاف مرضی ہندوستان کو جرمنی کے خلاف صف آرا کر دیا ہے۔ اور اس جنگ میں ہندوستانی ذرائع اور آدمیوں کو استعمال کرنے کی جو لوٹ گھسوٹ مچا رکھی ہے۔ ان افعال کی مذمت میں پبلک اظہار رائے تک کو بھی برداشت نہیں کر سکے گی۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی ایک ایسی پالیسی کے سامنے سر جھکانے کو تیار نہیں۔ جو ہندوستان کے قدرتی حق آزادی سے انکار کے مترادف ہو۔ جو پبلک رائے کے آزادانہ اظہار کو دباتی ہو۔ اور جو لوگوں کی گراوٹ اور متواتر غلامی کی طرف رہنمائی کرنے والی ہو اس پالیسی پر عمل کر کے برطانوی گورنمنٹ نے ایک ناقابل برداشت حالت پیدا کر دی ہے۔ اور وہ کانگرس کو عزت اور لوگوں کے ابتدائی حقوق کی حفاظت کی خاطر جدوجہد جاری کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔ کانگرس مہاتما گاندھی جی کی رہنمائی میں ہندوستانی آزادی کے حصول کے لئے عدم تشدد پر کاربند ہونے کی پابند ہے۔ لہذا قومی تحریک کے اس نازک مرحلہ

پر۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی مہاتما گاندھی جی سے درخواست کرتی ہے۔ کہ وہ لائحہ عمل کے اختیار کرنے میں اب کانگرس کی رہنمائی کریں۔ دہلی ریزولیوشن جس کی تصدیق آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے اپنے اجلاس پونا میں کی تھی۔ اور جو ان کی رہنمائی میں مانع تھا۔ اب جاری نہیں رہا۔ وہ زاید المعیاد ہو چکا ہے۔

آل انڈیا کانگرس کمیٹی برطانوی لوگوں کے ساتھ و دیگر ان ممالک کے لوگوں کے ساتھ جو اس وقت جنگ میں مبتلا ہیں۔ اظہار ہمدردی کرتی ہے۔ کانگرسی لوگ اس بہادری اور استقلال کی داد دئے بنا نہیں رہ سکتے۔ جو برطانوی قوم نے مصیبت اور تباہی کے مقابلہ کرنے میں دکھلائی ہے۔ ہم لوگ ان کے متعلق کسی قسم کے برے خیالات دل میں نہیں لا سکتے۔ اور ستیہ گرہ کا اصول کانگرس کو ممانعت کرتا ہے۔ کہ وہ کسی کو پریشان کرنے کے خیال سے کوئی کارروائی کرے۔ لیکن یہ خود ساختہ پابندی خودکشی کی حد تک جاری نہیں رکھی جا سکتی۔ کانگرس اپنی عدم تشدد پر مبنی پالیسی جاری رکھنے میں مکمل طور پر آزاد رہنے پر لازماً مصر ہے۔

مگر کانگرس خاموش مقابلہ کے میدان کو۔ اگر یہ

ضروری ہوگیا۔ تو موجودہ حالات میں وسیع کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔ وہ اسے لوگوں کی آزادی کی حفاظت کے حلقہ تک ہی محدود رکھنا چاہتی ہے۔

چند غلط فہمیوں کے مدنظر جو کانگرس کی عدم تشدد کی پالیسی کے متعلق پیدا ہو گئی ہیں۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی تازہ طور پر یہ بیان کرتی ہے۔ اور یہ صاف صاف کہتی ہے۔ کہ کانگرس کی وہ پالیسی ویسے ہی جاری رہے گی۔ ان چیزوں کی کچھ پرواہ نہ کرتے ہوئے۔ جو گذشتہ ریزولیوشن میں پائی جاتی ہیں۔ اور جن کی وجہ سے یہ غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہوں۔ یہ کمیٹی عدم تشدد کی پالیسی اور عمل میں مضبوطی سے اعتقاد رکھتی ہے۔ نہ صرف سوراجیہ کی جدوجہد کے لئے بلکہ جتنا عملی طور پر ممکن ہو سکے آزاد ہندوستان میں بھی۔ کمیٹی کا یقین ہے۔ اور دنیا کے موجودہ واقعات اس کی تائید کرتے ہیں۔ کہ اگر دنیا نے اپنے آپ کو تباہ نہیں کر لینا۔ اور دوبارہ وحشی پن کی حالت میں تبدیل نہیں ہو جانا۔ تو دنیا میں مکمل ترک ہتھیار کی پالیسی پر کاربند ہونا اور ایک نئے اور زیادہ منصفانہ سیاسی و مالی نظام کے قیام کی لازمی ضرورت ہے۔ لہذا آزاد ہندوستان اپنی تمام تر طاقت دنیا میں ترک ہتھیار کے حق میں استعمال کرے گا۔ اور اس مقابلہ میں اپنی مثال سے دنیا کی رہنمائی کرنے کو تیار رہے گا۔ ایسی رہنمائی

کا انحصار لازماً بیرونی امورات و اندرونی حالات پر منحصر ہو گا لیکن حکومت اس ترک ہتھیار کی پالیسی پر کاربند رہنے کی انتہائی کوشش کرے گی۔ موثر ترک ہتھیار بندی اور قومی جنگوں کے خاتمہ سے امن دنیا کے قیام کا آخری انحصار ان وجوہات کو جو جنگ اور قومی فسادات کا موجب ہیں۔ دور کرنے میں ہے۔ یہ وجوہات لازمی طور پر دور ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک ملک کا دوسرے ملک پر اقتدار جمانے اور ایک قوم یا گروہ کا دوسری قوم یا گروہ کی لوٹ گھسوٹ کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہندوستان پُرامن طور پر کوشش کرے گا۔ اور اسی غرض سے ہی ہندوستانی لوگ ایک آزاد اور غیر ماتحت قوم کا رتبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی آزادی۔ آزاد قوموں کے گروہ میں دیگر اقوام کے ساتھ منسلک ہونے کا پیش خیمہ ثابت ہو گی۔ جس سے دنیا میں امن اور ترقی کا دور دورہ ہو۔

ختم شد

شری رابندرناتھ ٹیگور کے افسانوں کا مجموعہ

ٹیگور کے افسانے

ایشیا کے شاعرِ اعظم ٹیگور کے پُرسحر معیاری افسانوں کا دلکش مجموعہ۔ جو انکا بہترین ادبی کارنامہ کہے جانے کا مستحق ہے۔ ایک ایک افسانہ کشش و دلفریبی سے پُر ہے۔ کہ آپ پر وجد طاری ہو جائے گا۔ ان افسانوں میں ادب اور زندگی دونوں عناصر شامل ہیں۔

قیمت عہ

پتہ:- امپیریل بک سٹال بازار گھنٹہ گھر امرتسر

ٹالسٹائی کی کہانیاں

روس کے نامور ادیب مہاتما ٹالسٹائی کا نام کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کی کہانیاں دنیا بھر کی زبانوں میں ترجمہ ہو کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ ہر کہانی میں ایک درد، ایک سوز پوشیدہ ہوتا ہے ان کی کہانیوں کا یہ مرقع ایک بے بدل چیز ہے۔ ہر افسانہ میں خاص کشش اور دلفریبی مضمر ہے۔

قیمت عہر

دربار ہارمونیم ماسٹر

بغیر استاد کے ہارمونیم سیکھنے کیلئے بالکل نئی کتاب

اس وقت تک باجہ سیکھنے کی کئی ایک کتابیں دیکھنے میں آتی ہیں مگر ان میں بہت سی اس قابل نہیں۔ کہ ان پر عمل کرنے سے ہی باجہ بجانا آجائے۔ وہاں کتاب کے ساتھ ساتھ استاد کی بھی ضرورت لازمی طور پر محسوس ہوتی ہے۔ مگر پنڈت چیف رام جی ہارمونیم ماسٹر نے نہایت ہی کوشش سے

دربار ہارمونیم ماسٹر

تیار کر کے اس کمی کو پورا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں جہاں باجہ سیکھنے کے آسان طریقہ اور نقشہ جات درج ہیں۔ وہاں ہر مذہب کے گانے اور بھجن بھی درج کر دیے ہیں۔ اور ہر گانے کی سرگم بھی ساتھ ہی دے دی ہے۔ باجہ سیکھنے والے اصحاب اس کتاب کو ضرور منگوا کر ملاحظہ فرماویں۔ قیمت صرف ۸/

پتہ:- امپیریل بک سٹال بازار گھنٹہ گھر امرتسر